www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

مغرب کے انشائیے

(تراجم)

سلیم آغا قزلباش

ساہتیہ اکیڈمی
نئی دہلی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

MAGRAB KE INSHAIYE

URDU

SALIM AGA QAZRBASH

RS. 50

1990

sadhana publications
D-41, Gulmohar Park,
New Delhi-110049.

Printed at:
Vijeta Offset Printers

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ترتیب

پیش لفظ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سلیم آغا قزلباش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 5

مغربی انشائیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندرجیت لال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 11

چاکلیٹ بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رابرٹ لنڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 19

لاعلمی کی موجیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رابرٹ لنڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 29

ایک فلسفی نہ ہوتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ رابرٹ لنڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 38

کیڑے مکوڑوں سے نفرت کیوں ہے ۔ رابرٹ لنڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 48

نوجوان نہ رہنے کے مزے ۔ ۔ ۔ ۔ جی کے چیسٹرٹن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 61

جاپان کا بھوت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی کے چیسٹرٹن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 69

بے کار رہنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جے ۔ بی ۔ پریسٹلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 76

منتخب تفاخرات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آلڈس ہکسلے ۔ ۔ ۔ ۔ 85

ناچیز کوما کی مدح میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیکوآئر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 92

روبصحت ہونا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چارلس لیمب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 99

رات اور چاندنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہنری تھوریو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 109

گھاس کا ایک پات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والٹ وٹمن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ 121

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کچھ مصنف کے بارے میں

نام: سلیم آغا قزلباش

تاریخ پیدائش: ۲۲ نومبر ۱۹۵۶ء لاہور

تعلیم: ایم۔اے (اردو)

مصنف کی دیگر کتابیں

(۱) سرگوشیاں (انشائیے)

(۲) منتخب انشائیے (انتخاب)

(۳) انگور کی بیل (افسانے)

(۴) آمنا سامنا (انشائیے)

(۵) نئے انشائیے (انتخاب، زیرِ ترتیب)

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سلیم آغا قزلباش

پیش لفظ

اُردو ادب کے ارتقا میں ترجمے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ اُردو افسانہ، ڈراما اور نظمِ آزاد کی ترویج و اشاعت کے پس پُشت تراجم کے سلسلے نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بصورتِ دیگر ان اصناف نظم و نثر کو ارتقائی منازل طے کرنے میں شاید خاصا طویل سفر طے کرنا پڑتا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، غیر ملکی ادب کو کسی زبان میں منتقل کرنے سے ادب مزید زرخیز ہوجاتا ہے اور بعض اوقات تو اس میں ادبی تحریکات بھی فروغ پانے لگتی ہیں جو بالآخر ذہنی بالیدگی پر منتج ہوجاتی ہیں۔ علاوہ ازیں ترجمہ کے اصول و ضوابط کے ضمن میں جس تواتر سے لکھا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تراجم کی وقعت اور اہمیت مسلّم ہے۔

اچھا ترجمہ کرنے کے لئے اصل تخلیق کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ضروری ہے تاکہ حتی المقدور اس کی اندرونی لَے سے خود کو ہم آہنگ کیا جاسکے۔ خصوصاً تخلیقی مواد پر مبنی تحریروں کے تراجم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے یہ عمل ناگزیر ہے۔ تاہم تخلیقی ادب کے سلسلے میں بھی، افسانہ اور ڈراما ترجمہ کرنا نسبتاً سہل ہے جبکہ شاعری اور انشائیہ جیسی اصناف کا ترجمہ کافی وقت طلب کام ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ترجمہ چاہے ملکی زبان سے غیر ملکی زبان میں کیا جائے یا غیر ملکی زبان سے ملکی زبان میں، اس کی عموماً دو ہی صورتیں مروج ہیں۔ اوّلاً آزاد ترجمہ ثانیاً لفظی یا بامحاورہ ترجمہ! آزاد ترجمہ کرتے وقت مترجم کی طرف سے حذف و اضافہ کا عمل نمایاں ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اصل تخلیق کے خدوخال ایک حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس نوع کے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اصل فن پارہ کا محض ایک ہلکا سا تاثر ہی قبول کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف لفظی ترجمہ کا فریضہ احسن طریق سے انجام پا جائے تو ایسی صورت میں قارئین تک اصل تخلیق کی ترسیل کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس سب کے باوجود ایک ملک کی زبان میں لکھی گئی کسی تخلیق کو کسی دوسرے ملک کی زبان میں منتقل کرنا ایک خاصا کٹھن کام ہے کیونکہ تخلیق کا رشتہ اپنی زبان سے بہت مضبوط ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اچھے سے اچھا ترجمہ بھی سو فی صد تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اُردو ادب میں غیر ملکی ادب کے تراجم کی کہانی بہت پرانی ہے۔ خاص طور پر فورٹ ولیم کالج کا رول اس سلسلے میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ بعد ازاں بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی ترکی، روسی اور انگریزی ادب کی اُردو زبان میں منتقلی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں برصغیر پاک و ہند کی علاقائی زبانیں مثلاً پنجابی، بنگالی، مراٹھی، گجراتی، پشتو، سندھی، بلوچی وغیرہ بھی ایک دوسرے کے ادبی سرمائے کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی تھیں جس سے ترجمے کا رجحان دوہری سطح پر جاری و ساری ہو گیا تھا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہمارا اُردو افسانہ آج جس بلند مقام پر کھڑا ہے اس کے عقب میں مغربی افسانوں کے تراجم کا ایک باقاعدہ سلسلہ نظر آتا ہے جو کم و بیش نصف صدی قبل شروع ہو گیا تھا۔ دوسری طرف اُردو ادب میں انشائیہ نگاری کا آغاز اس صدی کے پانچویں عشرے میں ہوا۔ مگر دیگر اصنافِ نظم و نثر کی طرح اسے تراجم کے ذریعے عوام میں مقبول بنانے کی باقاعدہ کوشش نہ کی گئی جس کے نتیجے میں آگے چل کر بعض الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ گزشتہ ایک دہائی میں انشائیہ کو ایک نزاعی صنفِ ادب قرار دینے کے معاملے میں جو گرد اڑائی گئی تھی وہ ایک بڑی حد تک بیٹھ چکی ہے اور اب انشائیہ کا مستقبل تابناک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مگر اس بات کی ضرورت بہرحال محسوس کی جا رہی ہے کہ اُردو انشائیہ کے خدوخال کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے بطور نمونہ یا مثال دیگر زبانوں کے انشائیوں کو اُردو زبان میں منتقل کیا جائے تاکہ اُردو ادب کے قارئین اور طالب علموں کو اُردو زبان میں لکھے گئے انشائیوں کے مزاج، معیار اور دائرہ کار کا بہتر طور پر شعور حاصل ہو سکے۔ اسی مقصد کو ذہن میں رکھ کر میں نے چند برس قبل انگریزی کے بعض منتخب انشائیوں کا اُردو زبان میں لفظی ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا جو آج ایک کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

لفظی یا بامحاورہ ترجمہ کرنا اور وہ بھی انشائیہ یعنی پرسنل ایسے جیسی نازک صنفِ نثر کا جو کسی بھی زبان و ادب کی تخلیقی نثر کا درجۂ کمال مانی گئی ہے میرے لیے انتہائی مشکل فریضہ تھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ترجمہ کرتے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوئے اصل تخلیق سے سرِ مو انحراف کروں اور آج مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ "مغرب کے انشائیے" میں ایک ترجمہ بھی ایسا نہیں ہے جو آزاد ترجمہ کی ذیل میں آتا ہو۔ بہر حال میں اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس بات کا اندازہ آپ ان تراجم کے مطالعہ کے بعد خود ہی کر لیں گے۔ میرے لیے فقط یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ ان تراجم کے بعد ایک عام قاری کے علاوہ ہمارے ان نوجوان قلم کاروں کو بھی انشائیہ کے اصل مزاج کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی جنھوں نے انگریزی زبان کے انشائیوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان تراجم کو پڑھنے کے بعد انھیں علم ہو جائے گا کہ فنِ انشائیہ نگاری کے مقتضیات کیا ہیں۔ نیز وہ یہ جان لیں گے کہ محض لفظوں کے طوطا مینا بنانے، لطیفہ گوئی کا رجحان اپنانے اور سطحی نوعیت کی پیش پا افتادہ باتیں لکھنے سے جو تحریر سامنے آتی ہے، اسے کم از کم انشائیہ تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کہنے کو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو انشائیہ نے مغرب کے انشائیہ کی پسلی سے جنم لیا ہے۔ مگر اب بفضلِ خدا یہ بالغ اور باشعور ہو چکا ہے۔ اس نے مغرب کے پرسنل ایسے کے تمام مثبت پہلوؤں کو خود میں سمونے کے بعد اب اس میں اپنی زمین، ماحول اور روایت کے عناصر کو بھی شامل کر لیا ہے اور یوں اس کی رگوں میں تازہ خون شامل ہو گیا ہے۔ لیکن اس نئی صورت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُردو انشائیہ مغربی پرسنل ایسے سے اکتساب کردہ بنیادی اُصولوں سے دست کش ہو چکا ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

امرِ واقعہ یہ ہے کہ اُردو انشائیہ نے مغرب کے انشائیہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دائرہ کار کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم کسی حد تک یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ مغرب کے انشائیہ کے برعکس برِصغیر پاک و ہند کے انشائیہ میں معروضیت کے عُنصر کے متوازی موضوعیت کا پہلو نسبتاً نمایاں ہے۔ پھر یہ کہ متصوفانہ اندازِ فکر کو بھی انشائیہ نے اپنے کینوس پر اُجالنے کی سعی کی ہے اور یوں ذہن کی آبیاری کرنے کے علاوہ رُوح کی سیرابی کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ اُردو انشائیہ عصری شعور کی ترجمانی کرنے کے علاوہ کائناتی شعور کا بھی اظہار کر رہا ہے۔ گویا "زمان اور مکان" کے سوالات بھی انشائیہ میں اظہار پانے لگے ہیں جو ذہنی بلوغت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ قطرہ میں دجلہ دکھائی دینے کا منظر اب اُردو انشائیہ میں نمایاں ہے۔

"مغرب کے انشائیے" کے مطالعہ سے مشرق اور مغرب کے خلاق اذہان کی سوچ میں جو تفاوت ہے اسے بھی بہتر سطح پر سمجھا جا سکے گا۔ مثلاً ایک یہ بات کہ مغرب کے پرسنل ایسے میں فطرت کی گود میں لیٹ کر لطف اندوز ہونے کا رویّہ توانا ہے جو فطرت یعنی NATURE سے انسلاک کی خواہش کا دوسرا نام ہے جب کہ برِصغیر پاک و ہند کے انشائیہ میں فلسفیانہ موشگافی اور نکتہ آفرینی من نسبتاً عام ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس میں "حیرت" کا پہلو زیادہ نمایاں ہے جو ایک بچے کو کسی نئی نویلی چیز کو دیکھ کر حاصل ہوتی ہے۔

انشائیہ کے ضمن میں یہ مطالبہ بھی منظرِ عام پر آیا ہے کہ اس میں "طنز و مزاح" کا عنصر نمایاں ہونا چاہئے۔ تو اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ آپ "مغرب

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے انشائیہ کا مطالعہ کر کے خود اندازہ لگائیے کہ انگریزی پرسنل ایسے میں پورا منہ کھول کر فلک شگاف قہقہہ لگانے کی کہاں تک اجازت ہے! اسی طرح وہ حضرات جو فلسفیانہ موشگافی کو انشائیے کے لئے مضرِ صحت سمجھتے ہیں، ان کے لئے بھی یہ تراجم لمحۂ فکریہ مہیا کر سکتے ہیں۔

آخری بات یہ کہ اُردو ادب میں صنفِ انشائیہ کی کم و بیش پینتیس سالہ ہنگامہ خیز تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس صنفِ نثر نے مخالفت کی منہ زور آندھیوں کے سامنے سینہ سپر رہ کر اپنا وجود تسلیم کرایا ہے۔ انشائیہ کے بارے میں مجھے بنیادی فضیحہ فقط یہ دکھائی دیا ہے کہ ایک مخصوص حلقہ "انشائیہ" کو "مزاحیہ" کے نعم البدل کے طور پر مروج کرنے کا خواہاں ہے چنانچہ بعض ایسے قلم کار حضرات سامنے آئے ہیں جو زورِ قلم سے سے زیادہ زورِ بازو کے والہ و شیدا ہیں۔ یہ کوئی صحت مند رویہ نہیں ہے۔

اور مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ جس دن انشائیہ کو "مزاحیہ" کی اصطلاح کے طور پر برتنے کی مہم ختم ہو جائے گی، انشائیہ کے بارے میں پھیلائے گئے مفروضے، شبہات، پھبتیاں اور قہقہہ بازیاں بھی اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ بہر حال مغرب کے انشائیے کے مطالعہ سے ایک عام قاری پر یہ بات بخوبی واضح ہو سکتی ہے کہ انشائیہ، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے ایک بالکل مختلف شے ہے۔

سلیم آغا قزلباش

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اندرجیت لال

مغربی انشائیہ

لفظ ایسے (ESSAY) فرانسیسی لفظ اساتی (ESSAI) سے انگریزی زبان میں آیا۔ اس کا لغوی مفہوم ہے 'کوشش'۔ انشائیہ انگریزی زبان میں ایک قابل قدر صنف ادب ہے۔ اس میں مقالہ یا مفہوم کی صورت میں شخصی تاثرات، جذبات یا فلسفیانہ و حکیمانہ تفکرات کو پیش کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے پرسنل ایسے یا ایک نارک صنف مانا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار کا رول کبھی سماجک فلسفی، کبھی نقاد اور کبھی مقالہ نگار کا ہوتا ہے۔ انشائیہ کا کوئی اپنا واضح اسلوب نہیں ہوتا۔ یہ طویل بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی۔ اس کا لب و لہجہ سنجیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور شوخ بھی۔ یہ جذباتی بھی ہو سکتا ہے اور محسوساتی بھی۔ یہ طنزیہ بھی ہو سکتا ہے اور فلسفیانہ اور مزیہ بھی۔ اس کے موضوعات میں معمولی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں اور اعلیٰ مضامین بھی۔ یہ کسی بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور ایک عام سکول کے بچے کے متعلق بھی۔

انگریزی میں انشائیہ فرانسیسی زبان سے آیا۔ کہتے ہیں سولہویں صدی میں ایک فرانسیسی ادیب مائیکل ڈی مونٹین (MICHAEL DE MONTAIGN) (۱۵۳۳-۱۵۹۲) نے فن ادب کی داغ بیل رکھی۔ ان دنوں انشائیہ کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ پرانے روم اور یونان کی عالی مرتبہ شخصیات کی زندگیوں کے کسی پہلو یا گوشہ پر اس طرز سے لکھا جاتا کہ پڑھنے سے کچھ نہ کچھ اخلاقی درس حاصل ہو۔ ان دنوں کے انشائیوں میں مثبت قدروں یعنی ایمانداری، بہادری کو نفس مضمون بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں مونٹین نے روایتی طرز پر کچھ انشائیے لکھے لیکن بعد میں اس نے اپنی تحریر میں خاصی آزادی پیدا کر لی۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کہتے ہیں مونٹین جو کچھ اپنے تاثرات میں دیکھتا یا جس موضوع پر غور و خوض کرتا اُس پر آزادی سے مقالے لکھتا۔ اس نے مختلف موضوعات پر ہلکے پھلکے اور فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات اور موثرات کو ایک بار ربط اور ایک ادبی زبان میں پیش کیا۔ مونٹین نے اپنے انشائیوں کے نقش اول پر یوں لکھا ہے: "میں نے ان انشائیوں میں اپنے آپکو منعکس کیا ہے۔

مونٹین نے ایک انشائیے 'رسم و رواج' میں ایک فلسفی کے اس قول کی حمایت کی ہے: "کیا یہ فلسفی کے لئے باعث شرم نہیں کہ ایسے انسانوں سے سچائی کی تصدیق کرائے جو رسم و رواج کے پابند ہیں اور جن کے قلوب رسوم سے جکڑے ہوتے ہیں۔ فلسفی سے مراد وہ شخص ہے جو مشاہدہ کی فکر و نظر رکھتا ہو اور جو فطرت کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے۔

مونٹین کے زمانہ سے پہلے انگریزی میں انشائیے نام کی کوئی صنف موجود نہ تھی۔ چنانچہ جان فلوریو (JOHN FLORIO) نے پہلی بار فرانسیسی انشائیوں کے ترجمے کر کے انگریزی داں طبقے کو اس صنف سے روشناس کرایا۔

سترہویں صدی میں فرانسیس بیکن (FRANCIS BACON) (۱۵۶۱ - ۱۶۲۶) نے انگریزی زبان میں اٹھاون انشائیے ۱۵۹۷ء سے ۱۶۲۵ء کے درمیان لکھے۔ آج بھی ان انشائیوں کو انگریزی ادب میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ بلکہ ان میں چند انشائیے تو ادبی شہ پارے بن چکے ہیں۔ بیکن کے انشائیوں میں غزل کے اشعار کی طرح زور بیان اختصار اور محاورہ کا بیان ہے۔ کئی جملے تو ضرب المثل معلوم ہوتے ہیں۔ ان انشائیوں میں تنقید حیات ہے اور کچھ تکلف اور غور و فکر کی گہرائی بھی۔ ان میں فلسفیانہ عنصر بھی ہے اور کچھ رومانیت بھی۔ بیکن کے الفاظ میں انشائیہ ایسی مختصر تحریر ہے جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے۔ بیکن کے ایک انشائیے 'آف سٹڈیز' (OF STUDIES) سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ 'مطالعہ خوشی بکھیرتا ہے۔ فصیحت میں آرائش کا سامان بنتا ہے اور قابلیت بڑھاتا ہے۔ اگر آپ فراغت میں ہوں خوشی آپ کے دامن میں رہے گی۔ گفتگو میں مطالعہ سے حاصل کی ہوئی قابلیت آپکے ملنوں اور کاروباری مسائل میں آپ کی معاون ہوگی۔ اسی انشائیے میں آگے چل کر بتاتے ہیں: کئی کتابوں کا محض ذائقہ لینا ہی کافی ہے۔ کئی کتابوں کو خوب نگلنا ہوتا ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور کچھ کو خوب چبا کر کھانا اور ہضم کرنا ضروری ہے۔ مطالعہ ایک انسان کو انسان سے مکمل انسان بنا دیتا ہے۔ گفتگو سے انسان کا ادراک کچھ قوی ہو جاتا ہے اور تحریر سے انسان ایک متوازی انسان بن جاتا ہے۔

اس صدی میں ایک انشائیہ نگار جان ارل (JOHN EARL) اور اس کے ایک اور معاصر سر ٹامس اوور بری (SIR THOMAS OVERBURY) نے اپنے دور کے عورتوں مردوں کے کرداروں کا اپنے انشائیوں میں تجزیہ کیا۔ ان دونوں ادیبوں نے ڈیری فارم میں کام کرنے والی عورتوں سے لیکر بلند مرتبہ سیاستدانوں تک کی کردار نگاری کی اور انسانی فطرت کے گوناگوں پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ جان ارل کا انشائیہ مائیکرو کاسموگرافی (MICRO COSMOGRAPHY) طنز و مزاح کا ایک نادر نمونہ ہے۔

اٹھارہویں صدی میں ایڈیسن (ADDISON) سٹیل (STEELE) گولڈ سمتھ (GOLD SMITH) اور سفٹ (SWIFT) نے انگریزی انشائیوں کو اپنے اپنے فن اور تفکرات سے معمور کیا۔ ڈاکٹر جانسن کے الفاظ میں "جو کوئی بھی انگریزی اسلوب کو اپنانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایسا طرز نگارش اختیار کرے جو جانا پہچانا معلوم ہو۔ جو حسین بھی ہو اور تکلف سے معرا بھی تو ایسے ادیب کو ایڈیسن کے انشائیے دن رات پڑھنے چاہئیں ایڈیسن نے لگ بھگ چار سو انشائیے لکھے ان میں زیادہ تر انشائیے اس دور کے فیشن۔ لباس طنز و مزاح گفتگو وغیرہ پر ہیں۔ کچھ سکولوں۔ لائبریریوں۔ کلبوں۔ کالجوں پر بھی ہیں۔ سفٹ کا شعور انشائیے کے لئے فٹ نہ تھا۔ وہ زیادہ ذہین اور طنزیہ نثر لکھنے کا عادی تھا۔ پھر بھی اس کے چند انشائیے قابل ذکر ہیں۔

سر رچرڈ سٹیل (SIR RICHARD STEELE) (۱۶۷۲-۱۷۲۹) ایک فاضل ادبی رکا مالک تھا۔ اس نے کئی نظمیں۔ کامیڈیاں اور سیاسی اور صحافتی نگارشات پر طبع آزمائی اس نے سب سے زیادہ نام (THE TATLER) (۱۷۰۹) نام کے رسالے اور بعد میں (THE SPECTATOR) نام کے رسالے سے پیدا کیا۔ اس ادبی کام میں ایڈیسن اہل قدر رفیق و معاون بنا۔

رسائل میں رموز حیات پر فلسفیانہ رنگ میں افکار پریشاں شائع ہوتے تھے۔ صرف لندن میں ہی لگ بھگ ساٹھ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے جن میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر انشائیے شائع ہوتے تھے۔ ان اخبارات اور رسائل نے انشائیوں کو ایک ہر دلعزیز صنف بنا دیا۔ سٹیل اخلاقی اوصاف اور انسانی صفات کو انسان کی سرشت میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہ اپنے وقت کے معاشرے کی خرابیوں اور بے اعتدالیوں کی طرف اٹھتی رہی اور اس کے انشائیوں کا مواد فراہم کرتی رہی۔

اٹھارہویں صدی کے انشائیہ نگاروں پر آلیور گولڈ سمتھ کا نام ممتاز ہے۔ اس کے انشائیوں میں ایک ہلکا سا مزاح جھلکتا ہے۔ زبان کی چاشنی اور خیالات کی تازگی اس کے انشائیوں کی جان ہے۔ سیمیول جان سن (SAMUEL JOHNSON) کے انشائیوں میں تکلف کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اس کا سٹائل بھی ایک حد تک لاطینی رہا۔ جان سن کبھی کبھار انشائیے لکھتا تھا۔ اس کے انشائیے "تنہائی کے حق میں" اور "اچھا مزاح" اس کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ "اچھا مزاح" میں جان سن لکھتا ہے: "اچھے مزاح کو اچھے کرداروں کی طرح پست نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی نگاہ میں مزاح ایک سستا اور نیم وحشی صنف سمجھا جاتا ہے۔ مزاح کی بہت خوبیوں کو ایسے لوگ ضرور نظر انداز کر جاتے ہیں جن میں اپنے مرتبہ یا شخصیت کے گھٹنے کا احساس ہو۔ دراصل ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے کہ وہ دوسروں کا تمسخر اڑائیں۔"

جان سن کے الفاظ میں انشائیہ ایک ذہنی ترنگ ہے جس میں بے ترتیب غیر منضبط اور ناپختہ خیالات اور جذبات کا اظہار ہو۔ ڈاکٹر جان سن کے الفاظ میں آلی ور گولڈ سمتھ نے ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کی اور سب کو یکساں طور پر اپنے فکر و فن سے مزین کیا۔ گولڈ سمتھ کے انشائیوں میں تخیلی بیان زیادہ ہے۔ کچھ انشائیے اخلاقی رنگ میں بھی ہیں۔

چارلس لیمب (CHARLES LAMB) کو انگریزی انشائیوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ ان میں اس کا نرم و لطیف دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ لیمب زیادہ تر اپنی زندگی سے اخذ کئے موضوعات پر انشائیہ پرورزی کرتا ہے۔ "ایلیا" (ELIA) کا انشائیہ اس کی سوانح حیات کا مظہر ہے۔ اس کے انشائیوں میں دانشوری فلسفہ اور انسانیت کا عنصر ہے۔ کہیں کہیں لیمب ستر ہویں صدی کے انشائیہ نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔ ای۔ وی۔ لوکس (E.V. LUCAS) کے الفاظ میں "انشائیوں کی صف میں جس میں بیکن، ایڈیسن، سٹیل، گولڈ سمتھ، ہیزلیٹ، لی ہنٹ، میکالے سب کھڑے ہیں" چارلس لیمب (CHARLES LAMB) کا نام نظر آتا ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

(۱۷۷۵-۱۸۳۴) نے انگریزی انشائیوں میں لطافت بیان اور حیات اور کائنات پر بھرپور تنقید کی ہے۔ چارلس لیمب اپنے انشائیے "روبصحت ہونا" میں لکھتا ہے "بیماری والی روح پرور کیفیت کچھ اس نوعیت کی ہے کہ ہر آدمی کے لئے یہ ایک سندر سپنا ہے۔ سپنا کہ وہ بستر پر دراز ہو جائے اور اپنے اوپر دن کی روشنی کو روکنے والے پردے تان لے۔ تاکہ وہ ان امور سے مکمل تغافل برت سکے۔ جو اس کی روشنی میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اس کے انشائیوں میں طنز بھی ہے اور لطافت بھی۔ ویسے لیمب زندگی سے فراریت کا قائل ہے۔

ولیم ہزلیٹ (WILLIAM HAZLITT) (۱۷۷۸-۱۸۳۰) نے ادبی اور متفرق طرز کے انشائیے لکھے۔ جن میں موضوع زیادہ تر شغل فن۔ سیرت اور انسان قابل ذکر ہیں۔ اس ادیب کو بڑا جمالیاتی ذوق حاصل تھا۔ یہ پہلا انگریز انشائیہ نگار ہے۔ جس نے شاعری کے بغیر زبان پر عبور حاصل کیا۔ اس کے انشائیوں کے سات مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں ہزلیٹ کے انقلابی خیالات اور اس کے لطیف مشاہدات ان انشائیوں کا حسن ہیں۔ "میرا شاعروں سے پہلا تعارف" "سفر پر" "پرانی کتابوں کا مطالعہ" "ناموافق لوگ" "مزاج" "جھگڑا" اس کے بہترین انشائیے ہیں۔ ان میں ہزلیٹ ذاتی ذوق، ذاتی دلچسپیوں اور ذاتی رجحانات کے مطابق بڑی خوبصورتی سے لکھتا ہے۔ ان میں اس کی حقارت آمیز نظر اور اقوال کا تکرار زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ ان انشائیوں میں ہزلیٹ کئی ذرائع سے اقوال کو استعمال کرتا ہے۔ اس کے شاہکار، اس کی رعنائی خیال کو آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں جان رسکن (JOHN RUSKIN) اور ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے کچھ انشائیے لکھے۔ رسکن کے انشائیوں میں فطرت سے لگاؤ، خلوص، سادگی اور بیان کی دلکشی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا ایک انشائیہ "ایک پات" بین الاقوامی شہرت کا درجہ بے پایا: "یہ پات ایک زرد رنگ کا اندر سے دھندلا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے بارے میں سوچیں اور فیصلہ کریں کہ وہ تمام پتوں جو موسم گرما کی فضا میں دمکتے ہیں اور وہ تمام تنومند اور خوش اندام شجر جو کو طراوت بخشتے ہیں مثلاً سرو قدبام او، نوبر تنومند ایش اور شاہ بلوط خوشبودار لدی چندی انگور کی بیل۔ کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جس سے انسان نے اتنی رخدا نے جس کی اتنی قدر کی ہو جس کا اس کے پات کی۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میتھیو آرنلڈ (MATTHEW ARNOLD) نے تنقیدی انشائیے لکھے۔ جن میں استقلال اور جدت غالب ہے۔ اس کے انشائیے اختصار اور جامعیت کے بہترین نمونے ہیں

رابرٹ لینڈ (ROBERT LAND) ۱۸۷۹-۱۹۴۹ء نے انشائیہ نگار کی حیثیت سے بڑا نام کمایا۔ اس کے انشائیوں میں اول تو اس کی لطافت ہے۔ دوسرے اس کے اسلوب کی جدت اس کے طرز نگارش کو ممتاز کرتی ہے۔ 'لاعلمی کی موجیں' میں وہ لکھتے ہیں: "ہم عمر بھر پرندوں میں گھرے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہمارا مشاہدہ اتنا کمزور ہے کہ ہم میں سے اکثر یہ نہیں بتا سکتے کہ آیا چڑیا گاتی ہے یا نہیں یا پھر کوئل کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ ہم چھوٹے بچوں کی طرح اس بات پر آپس میں الجھتے ہیں۔ کہ آیا نر کوئل اس وقت گاتا ہے جب وہ اڑان بھر رہا ہوتا ہے یا اس وقت جب وہ شاخ میں دبکا بیٹھا ہوتا ہے۔"

ایک ہم عصر سے ناول نگار سے کسی بدیشی نے ایک بار یہ سوال کیا تھا کہ انگلستان کی اہم ترین فصل کون سی ہے تو اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جواب دیا تھا "رائی"۔ جہالت اتنی مکمل تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس نے عظمت کو چھو لیا ہو۔ لیکن جاہل آدمیوں کی لاعلمی تو اس سے کہیں افزوں ہوتی ہے۔ ایک اوسط ذہن کا عام آدمی جو ٹیلی فون کو استعمال کرتا ہے۔ اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتا کہ ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے۔ وہ ٹیلی فون کو بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے باپ دادا انجیل مقدس کے معجزوں کو بغیر کسی ثبوت کے برضا و رغبت مان لیتا ہے۔ وہ نہ اس کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور نہ ہی اس کے سلسلے میں کوئی توجیہ لوجیہ رکھتا ہے۔"

ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے (T.H. HUXLEY) ایک عالمی سائنسدان اور ادیب ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات میں ادب بھی ہے۔ اور فلسفہ بھی اور سائنس بھی۔ اپنے انشائیے 'قدرتی علم کو بڑھانے کی ضرورت' میں لکھتے ہیں۔ "جو علم کو قدرتی طور پر بڑھانا چاہتا ہے وہ کسی کے جلال کو قبول نہیں کرتا ایسے انسان کے لئے شک و شبہ ایک عظیم زیور ہے۔ اندھا وشواس ایک ناقابل معافی گناہ۔ ایسا آدمی کسی بڑے نام یا عتاب سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ اندھا وشواس کو سرے سے اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تجربے اور قول کو فطرت کی کسوٹی پر پرکھنے کا قائل ہوتا ہے۔"

موجودہ دور میں ٹی ایس ایلیٹ (T.S. ELIOT) ۱۸۸۸-۱۹۶۵ء جو نوبل انعام یافتہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور جدید شاعری اور تنقید کے بنیادی مباحث پر تنقیدی و تنقیدی انشائیوں کے مصنف بھی ہیں۔ ایک انشائیے "روایت اور انفرادی ملکہ" میں فرماتے ہیں "شاعری جذبات کا اظہار نہیں۔ بلکہ جذبات سے فرار ہے۔ یہ شخصیت کا اظہار بھی نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے"۔ ایلیٹ نے مزید انشائیے عبدالرزاق کے ڈرامہ نگاروں (جانسن و ملڈلٹن) پر لکھے کچھ انشائیے "کلاسیکی کیا ہے"۔ "مذہب اور ادب" "تجربہ اور تنقید" "تنقید کی حدود" "شاعری کا سماجی منصب" قابل ذکر ہیں۔ ایلیٹ نے انشائیوں کے ذریعے انگریزی ادب کی قدروں کو نئی ترتیب و اہمیت کے ساتھ متعین کیا ہے اور انگریزی ادب کا یوروپی اقدار، تہذیب اور کلچر کے ساتھ رکھ کر جائزہ لیا ہے۔ ایلیٹ نے اپنے انشائیوں کے ذریعے نئے رجحانات کا مطالعہ کیا ہے اور مختلف عوامل اور رویوں کو واضح کیا ہے۔

جی کے چیسٹرٹن (G.K. CHESTERSON / ۱۹۳۶-۱۸۷۴) ایک صحافی اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ خوبصورت الفاظ اور ترکیبیں وضع کرنے میں اس کا جواب نہیں۔ اس ادیب کو عام فہم موضوعات میں سے نئے نئے اور منفرد خیالات تراشنے میں بڑا کمال حاصل ہے صحافی ہونے کی وجہ سے اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کئی انشائیے لکھے جن میں شگفتہ بیانی دلچسپی اور مزاح ہے۔ بستر میں بیٹھے رہنا سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ "بستر میں لیٹے رہنا ایک خوبصورت اور عظیم تجربہ سمجھا جا سکتا ہے صرف اس حالت میں جب لیٹنے والے کے ہاتھ میں رنگین پنسل اتنی لمبی ہو کہ وہ اس سے چھت پر لکھ سکے۔ اب افسوس یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں ایسی چھتیں میسر نہیں۔ ان حالات میں اپنے داہنے ہاتھ کی طرف کچھ روغنی رنگ کی بالٹیاں اور ایک جھاڑو رکھ کر ڈرائنگ کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک تخلص ہوشیاری سے رنگوں اور جھاڑو کو استعمال کرے اور رنگ کے بڑے بڑے نشان چھت پر لگاتا جائے تو وہ بے پناہ لطف اٹھا سکتا ہے۔ اگر رنگ کے ننھے ننھے قطرے حضرت کے چہرے پر گرنے لگیں تو یوں سمجھیے خوبصورت اور رنگین پھوار جھڑ رہی ہے۔ اس پھوار کے کچھ نقصان بھی ہیں۔ اس پر جھاڑو کی طرف سیاہ اور سفید روغنوں سے ہی مرقع آرائی کی جائے اور اگر سفید چھت میسر ہو تو ایسی رائی کا جواب نہیں میرے خیال میں سفید چھت کا ایسی مرقع آرائی کے سوا اور بہتر کیا ہو سکتا ہے۔"

ہیرلڈ ایلیٹ (۱۹۳۹-۱۹۰۱) یوں تو ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے پایا۔ ہاں اس کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک انشائیے ..... ہم نے [illegible] ایک [illegible] پڑھی۔ اس انشائیے میں مصنف نے یوں لکھا ہے گویا اس پر یہ تھا کہ آج کا انشائیہ نگار اپنی تحریر میں کچھ حسن کچھ لطافت مہیا کرے گا پر اس نے فقط علم نگاری ہی کا حق ادا کیا ہے۔ آج کا انشائیہ نگار اپنی تحریر کو بالکل سجا سنوار تا نہیں بس خالی جگہ پُر کرتا ہے۔ اس کے لئے طوالت مختصر کوئی اصول کارفرما نہیں ہوتا۔ بس [illegible] جی میں آیا کچھ نہ کچھ لکھ کر کام ختم کر دیتا ہے۔ اس سے کوئی منفعت نہیں ہوتی [illegible] ذہن میں کوئی تاثر پیدا ہوتا ہے۔

آج کا انشائیہ نگار کوئی نئی بات لکھنے کا عادی ہی نہیں رہا۔ پرانی باتوں اور مطبوعہ خیالات کو [illegible] توڑ موڑ کر پیش کر پاتا ہے۔ بلکہ وہی باتیں دُہراتا ہے۔ بلکہ دہرا لیتا ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف انشائیہ نگاروں نے مختلف اسٹائل سے ادا کیا ہے۔ اسے انشائیہ نگاری نہیں کہتے پروگریشن ہیٹ۔ چاہے ایسے اس قماش کے انشائیہ نگار بنے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے لوگ جنہیں [illegible] علم نگاری پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ انشائیہ نگاری سے کوسوں دُور چلا جاتا ہے۔

انشائیہ نگاری ایک بانس پر پھولوں مالائیں سجا کر رقص کرنے کا کام نہیں۔ یہ کڑی محنت طلب کام ہوتا ہے۔ ساتوں دان اور چوبیس گھنٹے انشائیہ نگار سر کھپائی کر کے اور بغیر سستائے [illegible] تو بات بنتی ہے۔ قلم برداشتہ لکھنے یا اوٹ پٹانگ لکھنے کو انشائیہ نگاری نہیں کہتے یہ ایک سنجیدہ فن سوچ اور متانت کا متقاضی ہوتا ہے۔" یہ ایک سنجیدہ انشائیہ نگار کی رائے ہے جو ہر فرد و بشر کو قابل قبول ہوگی۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

رابرٹ لیسٹڈ

چاکلیٹ بس

میں لندن کے گلی کوچوں میں چاکلیٹ بس کے نمودار ہونے پر تاسف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس بنا پر نہیں کہ مجھے ایک نئے رنگ والی بس کی آمد پر اعتراض ہے بلکہ اس کے برعکس میں تو ہمیشہ سے موٹر بس کو پرانی گھوڑا گاڑی کا ایک کم حیثیت جانشین سمجھتا آیا ہوں، خصوصاً اس وجہ سے کہ گھوڑا گاڑیاں پکاڈلی میں اتنے ہی رنگوں میں مل جایا کرتی تھیں جتنے رنگ آپ "رنگوں والے ڈبے" میں پاتے ہیں جبکہ موٹر گاڑیاں ایک مقررہ رفتار سے سرخ رنگ کی تھکا دینے والی یکسانیت سے مسلسل یکے بعد دیگرے گزرتی رہتی ہیں تو یوں لگتا ہے کہ شخصیت سے ویسے ہی تہی ہیں جیسے کہ جینگا مچھلیوں کے ایک ہی طرح کے ڈھیر (اور بھی اُبلے ہوئے)۔ لیکن اگر گلی کوچوں میں کسی ایک نئے رنگ کی رونمائی ہو رہی تھی تو پھر سارے رنگوں میں سے کم از کم چاکلیٹ براؤن کو وہاں دیکھنے کی تمنا نہیں ہوگی۔ چاکلیٹ کی ایک خامی اس کا اپنا رنگ ہے۔ یہ چکھنے جس قدر لاجواب ہے۔ دیکھنے میں اتنا ہی ٹھس۔ کوئی بھی شخص اسے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کھانے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اگر اسے اپنے ذاتی تجربے سے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ اپنے چہرے مُہرے سے زیادہ چکھنے میں خوش ذائقہ ہے۔ اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ تلافی کے بڑے بڑے اُصولوں کے مطابق جو زندگی میں جاری و ساری ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پرندے جو نسبتاً کم خوش نما رنگ والے ہیں، نہایت ہی دلکش گیت گاتے ہیں اور وہ مٹھائیاں جو بدمزہ ہوتی ہیں اپنی مہک میں اتنی ہی بھرپور معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بس نہ تو ایک پرندہ ہے نہ مٹھائی اور نہ ہی اسے سُرخ، سبز، نیلی، پیلی، آسمانی، حنائی اور بنفشی رنگوں میں رنگا گیا ہے۔ تاہم مجھے زیادہ تر محض رنگ کی وجہ سے چاکلیٹ بس کو دیکھ کر ملال نہیں ہوا تھا، جب میں نے اسے اگلے ہی روز پہلی مرتبہ اس مخصوص راستے پر آہستہ آہستہ جاتے ہوئے دیکھا جو میرے غریب خانہ سے بمشکل سو گز کی دُوری پر ہے۔ بہرطور مجھے ان حالات میں کسی دوسرے رنگ والی بس پر بھی برابر کا معترض ہونا چاہیئے تھا۔ کچھ مدّت سے میری حتی المقدور یہی کوشش رہی ہے کہ بسوں میں سفر کرنے سے اجتناب برتوں اور میں اس معاملے میں اکثر و بیشتر نہایت آسان طریقے سے ان میں ٹھنسی ہوئی زائد بھیڑ اور اس کے منہ کے بھبھکوں کے کارن بس بدر ہونے میں کامیاب رہا ہوں۔ میں لندن کے کم از کم ایک اضافاتی قصبے کے باسیوں کا ہمنوا ہو کر یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ سب کچھ نہایت غیر شریفانہ ہے۔ اور عمر بھر کے لیے بس میں سوار نہ ہونے کی قسم کھا چکا ہوں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جیسے ہی میں کسی ایسی بس کو آتے ہوئے دیکھتا ہوں جس میں ایک آدھ نشست خالی ہو یا کم سے کم کھڑا ہونے کی جگہ ہو تو میرا ہاتھ اس کی جانب کسی عادی شرابی کے منہ کو بوتل کی طرف لپکتے ہوئے ہاتھ کی طرح

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

خود بخود دراز ہو جاتا ہے اور اگلے ہی لمحے میں اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح اس بس کے "بلیک ہول" میں مقید پاتا ہوں جو کہ ایک غیر فطری طریق سے بازاروں میں جھٹکے کھاتی پھرتی ہے اور اس کے یہ جھٹکے جو ناقابلِ برداشت ہیں میری ایڑی میں گھس کر اور میری بڑی پسلی میں گزرگاہ بنا کر جھنجھناتے ہوئے اوپر کی سمت بڑھتے چلے آتے ہیں تا آنکہ یہ میری کھوپڑی تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جسے فقط میرے ہیٹ نے اس چھت سے محفوظ و مامون کر رکھا ہے جو ہر ہچکولے پر دونوں اطراف سے اس پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ "یہی زندگی ہے" میں خود سے کہتا ہوں جب کہ میرے خالی ہاتھ میں تھاما ہوا بیگ اس اخبار سے اٹھکیلیاں شروع کرتا ہے جسے ایک بدمزاج بوڑھا آدمی پڑھنے کی کوشش میں ہے۔ میں سوچتا ہوں کیا یہی وہ تہذیب ہے جسے ہم اہلِ یورپ ساری دنیا میں ترویج دینے کی کوشش کر رہے ہیں، کیا یہی اہلِ یونان و روما اور دوسری تمام بڑی بڑی تہذیب یافتہ نسلوں کے خوابوں کی تعبیر ہے؟

بحرِ جنوبی کے جزیرے میں بسنے والا کس قدر بدنصیب ہے کہ ساحلی جھیل کے کنارے پر کاہلی سے پاؤں پسارے پڑا رہتا ہے اور یوں خود کو بس میں جھٹکے کھانے کے "ارفع" تجربے سے محروم کر بیٹھتا ہے! فیجی جزائر میں رہنے والے کے لئے یہ بات کتنی مایوس کن ہے کہ وہ آدمی کی طرح کسی کارڈینوسار کے شکم میں سوار ہونے کے بجائے کسی جنگلی جانور کی طرح پاپیادہ جگہ جگہ گھومتا پھرے۔ میں اس انداز میں بغیر کسی تاسف کے چلا جاتا ہوں اور اسی دوران کنڈیکٹر کو محض اس بات کے لئے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کرایہ بھی ادا کر دیتا ہوں کہ وہ مجھے سمٹ سمٹا کر اس جگہ گھسنے کی اجازت دے دے جہاں اگر کسی قاتل یا دو بیویوں کے شوہر کو بھی مقید کر دیا جاتا تو وہ دہائی دیتا کہ اس کے لئے قید و بند کی یہ زندگی ناقابلِ برداشت بنائی جا رہی ہے۔ اگر جیل خانہ "درونِ بس" سے کچھ ملتا جلتا ہوتا جہاں "کھڑا ہونے کی جگہ صرف پانچ حضرات کے لئے ہے" کا بورڈ آویزاں ہوتا تو کوئی بھی شخص اگر وہ پاگل یا پیدائشی مجرم نہیں ہے، کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کرتا جس کی پاداش میں اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دئے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا۔ میرے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی دوسری "اصلاحِ حوالات" مؤثر ثابت نہیں ہو سکتی کہ جیل خانوں کا وجود یکسر ختم کر دیا جائے اور مجرموں کو جیل بھیجنے کے بجائے موٹر بسوں کے اندر محبوس کر دیا جائے۔ تصور کیجئے کہ ایسی حالت میں ایک ماہ کی قیدِ بامشقت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ ہر روز ہمہ وقت کٹہرے کے ساتھ لٹکے رہنا، ٹکرانا، آگے پیچھے ہچکولے کھانا، ایک گلی میں سے جھٹکے کھاتے ہوئے دوسری گلی میں پہنچنا جو پہلی گلی سے زیادہ اداس ہو اور پھر تیسری گلی میں پہنچنا جو اس سے بھی زیادہ بے کیف ہو۔ اور کچھ پڑھنے کے قابل نہ رہنا بجز صابن، گیس کی چمنیوں اور بوٹ پالش کے اشتہارات کے۔ کبھی جنت الفردوس کی ہوا کے جھونکے کو محسوس نہ کرنا بجز اس خشک سالی کی صورت میں جو نصف گرد اور نصف دوسروں کے سانسوں سے مرتب ہوتی ہے۔ اور ایک ایسی جگہ پہ لوگوں کے انبوہ میں گھرے رہنا جہاں کوئی اپنے عزیز ترین دوستوں کے ہجوم میں بھی کھڑا رہنا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

گوارا نہ کرے۔ دانتے اگر چاہتا تو جہنم کی سزاؤں میں اس سزا کو بھی شامل کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک اس کا اور تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ یہ آپ کو اس جگہ تک نسبتاً سبک رفتاری سے لے جاتی ہے جہاں آپ جانا چاہتے ہوں یا جس جگہ کو آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہاں جایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بسوں کا استعمال مجرموں تک محدود کر دینے کے حق میں ہوں کیا قدیم زمانے کے لوگ مجرموں کو بالکل اسی انداز سے سزا نہیں دیا کرتے تھے جب وہ انھیں میخوں سے اٹے مشکوں میں بند کر کے پہاڑی سے نیچے لڑھکا دیتے تھے؟

بسوں سے میرے تنازعہ کے اس مقام پر میرا یہ رویہ شاید غیر منطقی نظر آئے کہ میں بسوں کی نئی کھیپ کا (جو ظاہر ہے کہ سفر کی گھٹن کو دور کرنے کے لئے لائی گئی ہے) اس ناروا انداز میں خیر مقدم کر رہا ہوں۔ تاہم اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میرے پاس اس کا ایک معقول جواز بھی ہے۔ اس لئے جب پہلی چالکلیٹ بس میرے گھر والے روٹ پر نمودار ہوئی، میں تمام موٹر بسوں سے کچھ اتنا دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ میں نے از سر نو چہل قدمی کا فن سیکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا ـــــ ایک ایسا فن جسے میں تقریباً فراموش کر بیٹھا تھا۔ ایک روز میں سچ مچ پیدل چل نکلا۔ میں نے اس حرکت کو انتہائی پُرکیف محسوس کیا۔ اس میں ایک قسم کا قدرتی آہنگ تھا۔ اب مجھے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ لندن کے ایک سے دوسرے علاقے میں جاتے ہوئے مجھ سے بڑی کوئی طاقت مجھے اِدھر اُدھر سے پھینک رہی ہے۔ مجھے لگا کہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میں اس شکستی کی برابری میں ایک بوڑھے سست کی سی آہستگی کے ساتھ
چل سکتا تھا یا اس مرغی کی طرح چہل قدمی کر سکتا تھا جو مزے مزے سے
دانا دنکا چگ رہی ہو۔ اب میں جہاں چاہتا رک کر دکان کی کھڑکی میں سے
دکان کے اندر جھانکتا اور اٹھارھویں صدی کے بنے چمچوں کو یا ڈنڈی گیکوں کی
خوش سلیقہ ترتیب کو یا پھر اس سفری بیگ کو دیکھتا جسے میں خرید لیتا اگر
مجھے خریدنے کی استطاعت ہوتی یا پھر میں ایتھل ڈل کے تازہ ناول کے
سرورق پر چھپی تصویر کا دیدار کرتا یا موتیوں کے اس ہار پر نگاہ دوڑاتا جسے میں
فروخت کر ڈالتا اگر کوئی مجھے یہ مفت عنایت کرتا یا سبزی فروش کے ہاں
آلو چنے یا اجوائن خراسانی پر چسپاں قیمتوں کے کارڈ پڑھتا ــــ مگر یہ تو پیدل
چلنے کی بے پایاں مسرت کا محض ایک ادنیٰ سا جزو ہے ــــ سب سے بڑی
مسرت تو اس احساس میں ہے کہ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے نیز اس احساس
میں کہ ایک مقام سے سرپٹ دوڑ کر کسی دوسرے اسی جیسے مقام تک
پہنچنا ایک عالمگیر حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ ہم ہر
حال میں رواں دواں رہیں۔ یہ کام بھیڑ چراگاہ میں بکھی کھڑکی کے شیشے پر
اور چڑیا عین مینک پر انجام دیتی ہے۔ ہر جگہ جاندار مجبور ہیں کہ زندہ رہنے
کے لئے ٹہلتے پھریں، ناچیں یا ویسے ہی چہل قدمی کریں۔ لیکن وہ تحریک
جو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے، محض ایک جگہ سے دوسری جگہ تک
جانے کا نام نہیں ہے اسے ہم فقط اعضا یا پروں کی پُرآہنگ مشق کہہ سکتے
ہیں جس میں کسی خاص جگہ پر پہنچنے کا گھٹیا مقصد منظم نہیں ہوتا۔ وہ ننھے منے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پتنگے یا مچھر جو ایک لجلجے بادل کے ساتھ اوپر نیچے اڑتے ہیں کسی خاص جگہ جانے پر بضد نہیں ہوتے۔ مجھے تو یہ بات بھی مشکوک نظر آتی ہے کہ وہ کچھ کھانے پینے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ بات محض اتنی سی ہے کہ وہ جبلّی طور پر جانتے ہیں کہ کنکروں کے ڈھیر کی طرح کسی ایک جگہ ساکت و صامت پڑے رہنے کے بجائے سیاروں کی طرح مدام رواں دواں رہنے میں زیادہ لطف ہے۔ آدمی وہ واحد جاندار ہے جس نے تحرک کے اس ابدی حصار کو توڑ کر فرار حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور خود کو ٹھہراؤ کے عالم میں گویا مقید کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ نہ تو لنگڑا لولا ہے اور نہ ہی مُردہ! وہ اس جگہ سے جہاں کہ وہ اب ہے کسی دوسری جگہ جانے کا تو آرزومند ہے، مگر وہ نہیں چاہتا کہ اس کے لئے حرکت بھی کرے۔ چنانچہ اپنی عیاری سے اس نے متحرک رہنے کے یکے بعد دیگرے کئی ذرائع ایجاد کر لیے ہیں۔ اس نے فعالیت کو انفعالیت کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے۔ حتّٰی کہ اس نے بجری کے اس انبار کی طرح جو ٹرک انجن کی دھمک سے جاگ اُٹھنے کے بعد کھڑکھڑانے لگتا ہے اپنی کسی غیر اہم منزلِ مقصود پر جلد از جلد پہنچا دیے جانے کی آرزو تقریباً حاصل کر لی ہے۔

وہ انفعالیت کی اس انتہا تک سُست رفتار مرحلوں میں پہنچا ہے۔ لے اس بات کا آغاز بہ آسانی سدھ جانے والے جانوروں پر قابو پا کر انھیں اس بات پر مجبور کر کے کیا کہ وہ اسے اٹھا کر لے جانے کی خدمت ادا کریں۔ گھوڑے کی پیٹھ پر سواری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک حرکت

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کو ترک کر کے ایک متبادل حرکت اختیار کر لی ہے۔ سوار ہنوز اپنی حرکات کے سلسلے میں فعال ہے۔ اس کے پٹھے ویسے ہی نغماتی زیر و بم کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں جیسے پیدل چلنے کی صورت میں۔ وہ ایک بندہ بشر بننے کے بجائے ایک سنتور (ایسا عفریت جس کا سر آدمی کا اور دھڑ گھوڑے کا ہوتا ہے) بن گیا ہے۔ بالکل اسی طرح کشتی ایجاد کر کے آدمی نے بآسانی اپنے اس آہنگ کے دائرہ کار کو وسعت بخش دی۔ وہ پہیوں اور بادبانوں کو ایجاد کر کے از خود متحرک ہونے کے بجائے متحرک کئے جانے کی آرزو کے نزدیک تر ہوتا چلا گیا۔ اس نے جشن منانے کا اظہار کچھ یوں کیا کہ اپنے جوڑوں اور پٹھوں کو کاوش کی لذت سے آزاد کرنے میں تو اس نے لطف محسوس کیا مگر اس حالت میں بھی اس نے باگوں کو ڈھیلا چھوڑنے اور پھر کھینچنے، نیز بادبانی کشتی کو کھینے اور اس کا رُخ متعین کرنے کے مشاقانہ فعل میں لطیف اور ارفع لذتوں کا تجربہ کر لیا۔ اس کی سہل پسندی میں یوں اضافہ ہوا جیسے موٹر گاڑیوں اور دخانی جہازوں کے قد و قامت میں اضافہ ہوا اور یوں اس کی سہل پسندی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب وہ گاڑی چلانے یا کشتی کھینے کا کچھ زیادہ متمنی نہ رہا۔ وہ اب ایسے گھوڑے کی سواری پر مطمئن تھا جسے چلانا تک اسے نہ آتا تھا اور تو اور وہ کشتی کو یوں استعمال کرنا چاہتا تھا کہ جیسے کہ وہ کوئی سفری خواب گاہ ہو۔ اس کی اس بے توجہی نے میکانکی ذہن رکھنے والوں کے لئے ایک سفری موقعہ مہیا کر دیا۔ یہ جان کر کہ آدمی کیسی کاہل مخلوق ہے، انھوں نے ریلوے اسٹیشن اور بحری بجرے ایجاد کئے نیز موٹر بسیں اور زیر زمین ٹیوبز بنائیں تاکہ ان میں اس لاچار مخلوق کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت دئے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بغیر چوں و چرا قریہ قریہ پہنچایا جا سکے، ماسوائے اس ادنیٰ سی زحمت کے
کہ وہ اپنا ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر ٹکٹ کے لئے پیسے نکال لے۔ یہی
وجہ ہے کہ موجودہ دور میں نسل انسانی پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مسافروں کی ایک نسل
بنتی جا رہی ہے۔ کیا انسانوں کا وہ جم غفیر جسے ہم آج کل زیر زمین ریل کے اندر باہم
گتھم گتھا حالت میں دیکھتے ہیں، کالے پرندوں کے جھنڈ یا چیونٹیوں کے ایک وحشیانہ
رقص سے کسی طور کم مسرور نظر آتا ہے؟ یہ لوگ جیب میں پڑے سکوں کی طرح
کھنکتے تو ہیں لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے۔ وہ عجلت میں تو ہوتے ہیں لیکن
تیز رفتاری کا حسن ان کے سراپا میں سرائیت نہیں کرتا۔ ستاروں میں سب سے
حسین ستارے پر رہتے ہوئے، جہاں ندیاں بہتی ہیں، جہاں ایک تابدار چندرما
اُجلے فلک پر لڑھکتا ہے اور جہاں طیور اشجار پر نغمہ سنج اور بچے ان کے تلے
بے طرح کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں۔ وہ اس سارے پُرجلال منظر سے جو
محض ان کے لئے تھا بے توجہی برتتے ہیں تاکہ پہیوں کے اوپر ایستادہ ایک
فروزاں کئے گئے ڈبے کے اندر خود کو محبوس کر لیں اور زمین کے نیچے بے منظری
کی یکسانیت میں سے پوری رفتار کے ساتھ بھاگے جائیں۔ موٹر بس چاہے
۔۔ بالائے زمین کیوں نہ ہو، پہیوں کے اوپر ایک ڈبہ ہی تو ہے جو اپنے اندر
بسے ہوئے مسافروں کو ایک ایسی ہی بے کیف دنیا سے گزارتا ہے۔ جب کوئی اسے
بھاتا ہے تو اس کی حیثیت ڈاک میں سپرد کئے گئے خط سے زیادہ نہیں ہوتی۔
اب اس کے لئے منزلِ مقصود ہی سب کچھ قرار پاتی ہے اور منزلِ مقصود تک
سفر بے معنی ہو جاتا ہے۔ بے معنی لیکن بہر حال ایک ناگزیر شر: یہ اس ساری

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دانائی کی ضد ہے جو ہمیں سفر سے اتنا ہی لطف اندوز ہونے پر آمادہ کرتی ہے جتنا منزل سے ـــــ جو ہمیں ہر دم رواں دواں رکھتی ہے۔ چاہے ہم کسی خاص سمت میں نہ بھی آ جا رہے ہوں۔

اگر نسلِ انسانی جسمانی تحرک کی لذت کو ترک کرنے میں بطور ازالہ ذہن یا روح کے تحرک کی نئی لذتوں کی تحصیل کر رہی ہوتی تو موٹر بسوں کے حق میں مزید موشگافی ممکن تھی لیکن ذرا دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالئے، آپ اس میں کسی ایک گاؤں کی بھی نشان دہی نہیں کر سکیں گے کہ جس میں ذہنی یا روحانی نوع کی کسی ویسی ہلچل کا شائبہ بھی موجود ہو جیسی وہ ہلچل جس نے لندن سے گزرنے اور انسان کا کچوکر بنانے والی پہلی بس سے چار سو برس قبل سارے اٹلی کو سندرتا سے لبریز کر دیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں میری تمنا ہے کہ نئی چاکمیٹ بس ہر اعتبار سے کامیاب ہو۔ میں اسے ضرور استعمال میں لاؤں گا، لیکن میں ان تمام پا پیادہ آوارہ خرامیوں کو حسرت سے یاد کرتے ہوئے ایسا کروں گا جن میں مبتلا ہو کر میں تر و تازہ ہرے بھرے گول منول چلوں والے درختوں، کتب فروشوں، صرافوں، پھل فروشوں، تمباکو فروشوں اور گروی رکھنے والوں کی دکانوں اور ان کے پُر از افتخار اور قدیم سائن بورڈوں کے پاس سے بے اطمینان گزر جایا کرتا تھا، مگر جن سے میں اب تقریباً محروم کر دیا گیا ہوں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

رابرٹ لینڈ

لاعلمی کی موجیں

ایک اوسط ذہن کے عام سے قصباتی شخص کی معیت میں مضافات کے سیر سپاٹے پر نکلنا ناقابلِ عمل سی بات ہے۔ خاص طور پر اپریل یا مئی کے مہینوں میں اور وہ بھی اس کی لاعلمی کے وسیع بحرِ بیکراں پر حیران نہ ہوئے بغیر۔ یہ بات بھی ناممکن ہے کہ کوئی خود اپنی ہی لاعلمی کے لمبے چوڑے بحرِ اعظم پر حیرت زدہ نہ ہوتے ہوئے مضافات کی سیر پر نکل کھڑا ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد و زن بچے اور دیودار نیز تھرش اور بلیک برڈ کے زمزموں کے مابین جو فرق ہے اس کو جانے بنا زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ جدید شہر میں رہنے والا کوئی شخص جو تھرش اور بلیک برڈ کی نغمہ سنجی کے فرق کو جان سکے ایک استثنائی بات ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ پرندے ہم نے کبھی دیکھے ہی نہ ہوں۔ بات فقط اتنی ہے کہ ہم نے ان سب توجہ مبذول کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ ہم عمر بھر پرندوں میں رہتے ہیں۔ تاہم ہمارا مشاہدہ اتنا کمزور ہے کہ ہم میں سے بیشتر یہ نہیں بتا سکتے کہ CHAFFINCH[1] گاتا ہے یا نہیں یا پھر کوئل کا رنگ کیسا ہوتا ہے ہم چھوٹے

---

[1] درخت کا نام۔ [2] ایک قسم کی چڑیا۔ [3] گانے والا پرندہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بچوں کی طرح اس بات پر آپس میں الجھتے ہیں کہ آیا کوئل اس وقت گاتا ہے جب وہ اُڑان بھر رہا ہوتا ہے یا اس سے جب وہ شاخوں میں دبکا ہوتا ہے ——

کہیں جیپ مین نے فطرت کے بارے میں اپنے مشاہدے یا اپنے تصور کا نقشہ ان مصرعوں میں تو نہیں کھینچ دیا تھا:

جب برگد کی سبز باہوں میں
کوئل کوکو کرتی ہے
اور بہار کی سوہنی رُتوں میں
سب سے پہلے
لوگوں کا من موہ لیتی ہے

تاہم یہ جہالت کُلی طور پر پریشان کُن نہیں ہے۔ اس میں سے ہم دریافت والا لطف پیہم کشید کرتے ہیں۔ اگر ہم لاعلمی سے مناسب حد تک بہرہ ور ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ ہر فصلِ بہار میں فطرت اس طور ہمارے قریب آجاتی ہے جیسے وہ ابھی شبنم میں بھیگی ہوئی ہو۔ اگر ہم نے اپنی آدھی زندگی کوئل کا درشن کئے بنا ہی گزار دی ہے اور ہم اسے محض ایک آوارہ صدا کے طور پر جانتے ہیں تو ایسی صورت میں جب ہم اسے احساسِ جرم کے تحت ایک جنگل سے دوسرے جنگل کی طرف پرواز کرتے اور پرواز کے دوران کسی پہاڑی کے دامن میں چناروں کے جھنڈ میں اترنے سے قبل (کہ جہاں اس کی "بوجھو تو جانیں" والی موجودگی چھپ سکتی ہے) ہوا میں ایک باز کی طرح اپنی لمبی دُم کی لرزش کے ساتھ معلق ہوتے دیکھتے ہیں تو ہم اس نظارہ کی دید سے گویا کھل اٹھتے ہیں۔ یہ کہنا فضول سی بات ہوگی کہ ماہرِ فطرت پرندوں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی زندگی کے مشاہدے میں ذرا بھی لطف محسوس نہیں کرتا۔ حقیقتاً اس کا لطف مستقل نوعیت کا ہوتا ہے اور بُردبار می اور جاں سپاری والا مشغلہ ہے۔ اس چیز کا موازنہ اس شخص کے صبح سویرے والے جوش و خروش سے کریں کہ جس نے کوئل کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو اور اسے دُنیا ایک جہانِ دیگر محسوس ہونے لگی ہو۔ یہی سبب ہے کہ مسرت چاہے وہ ماہرِ فطرت کی ہو، کسی نہ کسی حد تک اس کا دارومدار اس کی لاعلمی پر ہے جو اس کے لئے ہنوز اس نوع کی دُنیاؤں کو مسخر کرنے کا موقع چھوڑ جاتی ہے۔ وہ شاید کتابوں کی وساطت سے علم کی اس آخری "می" تک پہنچ پایا ہے، لیکن خود کو اب بھی اس لمحے تک نیم جاہل ہی محسوس کرتا ہے جس تک وہ ہر چمکتے ذرّے کی اپنی لگاہوں سے چھان بین نہیں کر لیتا۔ اس کی یہ آرزو ہے کہ وہ کبھی تو اپنی آنکھوں سے مادہ کوئل کو دیکھ سکے ——— جس کا نظارہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے! ——— یعنی صرف اس وقت جب وہ زمین پر انڈہ دیتی ہے اور اسے اپنی چونچ میں پکڑ کر اس گھونسلے میں لے جاتی ہے جہاں اس کے لئے بچہ کو جنم دینا مقدر ہو چکا ہے۔ ماہرِ فطرت یکے دیگرے کئی دنوں تک دُوربین کو اپنی آنکھوں سے لگائے بیٹھا رہے گا۔ صرف اس بات کی تصدیق یا تردید کرنے کے لئے کہ کوئل گھونسلے میں نہیں بیٹھ پر انڈے دیتی ہے۔ اگر وہ تا حال اتنا خوش قسمت ہے کہ پرندوں میں اس انتہائی خفیہ مزاج پرندے کے بارے میں یہ جان چکا ہے کہ وہ کس سے انڈے دیتا ہے، پھر بھی اس کے لئے فی الوقت ایسے متعدد میدانوں لڑنے کا جواز باقی رہے گا جو اس نوع کے ڈھیروں تنازعی سوالات سے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بھرے پڑے ہیں، جیسے یہ سوال کہ کوئل کے انڈوں کا رنگ ہمیشہ ان انڈوں کے مانند ہوتا ہے جو پہلے سے گھونسلے میں پڑے ہوتے ہیں یقیناً سائنسدانوں کے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ اب بھی اپنی گم شدہ لاعلمی پر آنسو بہائیں۔ اگر وہ بادی النظر میں ہر چیز کے بارے میں پوری طرح آگاہ دکھائی دیتے ہیں تو یہ محض اس وجہ سے ہے کہ میں اور آپ کم و بیش کچھ نہیں جانتے۔ بہر وہ صورتِ حال جو وقوع پذیر ہو رہی ہو وہاں ہمیشہ لاعلمی کی دولت ان کی منتظر ہوگی۔ سر تھامس براؤن کی طرح وہ کبھی نہیں جان پائیں گے کہ وہ کون سا گیت تھا جو SIRENS نے یولیسس کو سنایا تھا۔

اگر ایک عام آدمی کی جہالت کو بیان کرنے کے لئے میں نے کوئل کا ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پرندہ پر میری گفتگو ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے کہ موسم بہار میں گرجوں کے قرب و جوار سے گزرتے ہوئے (جن پر یوں لگتا ہے جیسے افریقہ کی ساری کوئلوں نے ہلہ بول دیا ہے) مجھے ہمیشہ یہ خیال گزرا ہے کہ مجھے یا میرے واقف کاروں کو ان کے بارے میں کتنی کم واقفیت حاصل ہے۔ لیکن میری اور آپ کی جہالت کوئلوں تک محدود نہیں ہے یہ جملہ خلق شدہ اشیاء میں سرایت کر گئی ہے۔ ماہ و مہر سے لے کر ٹھیلوں کے ناموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ ایک زیرک خاتون کو یہ استفسار کرتے ہوئے سنا کہ کیا ہلال ہمیشہ ہفتے کے دن ہی نمودار ہوتا ہے؟ اس نے اپنی بات بڑھاتے ہوئے مزید کہا تھا کہ شاید بہتری اسی میں ہے کہ اس بات کا پتہ نہ چلنے پائے کیونکہ اگر کوئی یہ نہ جانے کہ ہلال کب نکلے گا یا آسمان کے کون سے گوشے میں وہ متوقع ہے تو اس کا ظہور ہمیشہ ایک خوشگوار تحیر کا سامان

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

فراہم کرے گا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ہلال ہمیشہ ایک حیرت زا انداز میں ظاہر ہوتا ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی باعثِ حیرت ہوتا ہے جو اس کے اوقاتِ کار سے واقفیت رکھتے ہیں اور بالکل یہی کچھ فصلِ بہار کی آمد اور پھولوں کی قطاروں کے نمودار ہونے کے سلسلے میں پیش آتا ہے۔ ہمیں گلِ نو دمیدہ کے اوّلین تحفہ کا نظارہ کرنے سے کچھ کم شادمانی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ہم اس کے سال بھر کے معمولات کے بارے میں کافی حد تک آگاہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم ماہِ اکتوبر کے بجائے مارچ یا اپریل کے مہینوں میں اسے تلاش کرتے ہیں۔ ہم اس بات سے باخبر ہیں کہ شگوفے سیب کے درخت پر پھل آنے سے پہلے آتے ہیں نہ کہ بعد میں۔ لیکن اس سے ہماری وہ حیرت کم نہیں ہوتی جو مئی کے باغ میں ایک خوبصورت تعطیل گزار کر ہمیں ملتی ہے۔

فصلِ بہار کی آمد کے موقع پر شاید بیک وقت بہت سے پھولوں کے ناموں کو مکرر یاد کرنے میں بھی ایک خاص قسم کا لطف مضمر ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اس کتاب کا از سرِ نو مطالعہ شروع کر دے جسے وہ تقریباً بھلا بیٹھا ہے۔ ماشین ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی یادداشت اس قدر ناقص تھی کہ وہ ہمیشہ پرانی کتب کو یہ سمجھ کر دوبارہ پڑھ ڈالتا کہ اس نے اس سے پہلے ان کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ خود میری اپنی قوتِ یادداشت بھی متلوّن اور رسنے والی ہے۔ پہلی اور دوسری قرأت کے درمیان کچھ نہ کچھ ذہن سے محو ہو جاتا ہے کہ میں جب "ہملٹ" کو پڑھتا ہوں نیز "پک ویک پیپرز" کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ نئے مصنفین کی رشحات ہوں اور ابھی ابھی چھاپہ خانہ سے برآمد ہوئی ہوں۔ ان میں سے بیشتر کا مواد پہلی اور دوسری اقساط کے مطالعہ کے دوران ہی دماغ سے محو ہو جاتا ہے۔ ایسے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مواقع بھی آتے ہیں جب اس نوع کی یادداشت ایک سزا کی شکل اختیار کر لیتی ہے، خصوصاً جب کسی کو صحتِ احوال کی طلب ہو۔ لیکن یہ صورت حال صرف اس وقت پیش آتی ہے جب زندگی کا مطمحِ نظر لطف اندوزی سے ماوراء ہو۔ محض تفتیش کے باب میں یہ بات محلِ نظر ہے کہ آیا بُری یادداشت کے خلاف جس حد تک کہا جا سکتا ہے، اتنا ہی کچھ اچھی یادداشت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک بُری یادداشت کے ساتھ کوئی بھی شخص پلوٹارک اور ہزار داستان کا تاحیات مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ بدترین یادداشت رکھنے کے باوجود معمولی نوعیت کی دھجیاں اور ناہموار سرے اس سے چھٹے ہی رہ جائیں گے۔ بالکل ان بھیڑوں کی طرح جو جھاڑیوں کے درمیانی فاصلے کو پھلانگتے ہوئے اپنی اُون کی چند چٹکیاں کانٹوں پر چھوڑ جاتی ہیں لیکن خود بھیڑیں اس میں سے گزر جاتی ہیں اور بڑے لکھاری بعینہٖ اپنی قابلِ پسند یادداشت کو پھلانگ کر گزرتے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے بہت ہی ناکافی آثار چھوڑ جاتے ہیں۔

لہٰذا اگر ہم کتابوں کو فراموش کر سکتے ہیں تو اتنی ہی آسانی سے ہم بیتے ہوئے مہینوں کو اور ان چیزوں کو جو ان مہینوں نے ہمیں دکھائی تھیں بھول سکتے ہیں۔ صرف لمحہ بھر کے لیے میں خود کو بتاتا ہوں کہ میں مئی کے مہینے کو ضربیں دینے والی ایک سیٹ کی صورت میں پاس کرتا ہوں۔ آج میں یہ بات بڑے وثوق اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ ہر کپ پھول پہ پانچ پتیاں ہوتی ہیں (کہیں چھ تو نہیں؟) گذشتہ ہفتے تو میں یہ بات حتمی طور پر جانتا تھا، لیکن آئندہ برس میں اپنا یہ حساب کتاب بھول چکا ہوں گا اور شاید ایک بار پھر سے مجھے یہ سیکھنا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پڑے گا تاکہ میں بٹرکپ پھول کو کیلنڈائن پھول سے خلط ملط نہ کر دوں۔ ایک بار پھر میں اجنبی نگاہوں سے دنیا کو ایک گلستان کی حیثیت میں دیکھوں گا۔ میں اس بات پر خود کو غور و خوض کرتے ہوئے پاؤں گا کہ یہ سائنس ہے یا جہالت جو کہتی ہے کہ سولفٹ (جو سیاہ چڑیا سے زیادہ کالی ہے اور اس کے باوجود گیت گانے والی چڑیا سے اس کا شجرۂ نسب ملتا ہے) کبھی ایک جگہ حتیٰ کہ گھونسلے میں بھی نہیں ٹکتی، بلکہ رات کے وقت فضاؤں کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ میں اس بات کو ایک نئی حیرت کے ساتھ جان جاؤں گا کہ وہ جو گیت الاپتی ہے نر کوئل نہیں ہے بلکہ مادہ کوئل ہے۔ مجھے شاید دوبارہ یہ سیکھنا پڑے کہ "کمپین" کو ایک خوش رنگ پتوں والا پودا کہہ کر نہ پکاروں اور یہ بات از سر نو دریافت کروں کہ آیا درختوں کی دنیا میں یہ پہلے آتا ہے یا بعد میں۔ ایک ہم عصر ناول نگار سے کسی بدیسی نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا تھا کہ انگلستان کی اہم ترین فصل کون سی ہے تو اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا تھا۔ "رائی" جہالت اتنی مکمل تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے عظمت کو چھو لیا ہو۔ لیکن جاہل آدمیوں کی لاعلمی تو اس سے کہیں افزوں ہوتی ہے۔ ایک اوسط ذہن کا عام آدمی ٹیلی فون کو استعمال کرتا ہے اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتا کہ ٹیلیفون کیسے کرتا ہے۔ وہ ٹیلی فون، ریل گاڑی، لائن ٹائپ، ہوائی جہاز کے وجود کو بلا تامل قبول ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے باپ دادا انجیلِ مقدس کے معجزوں کو بغیر کسی حیل و حجت کے برضا و رغبت مان لیا کرتے تھے۔ وہ نہ ہی ان کے بارے میں استفسار کرتا اور نہ ہی ان کے سلسلے میں سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم میں سے ہر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر خود اپنے گرداگرد واقعات کا ایک تنگ سا حصار کھینچ لیا ہے۔ زیادہ تر لوگ روزمرہ کے کام کاج کے دائرے سے باہر کے علم کی قدر و منزلت دکھاوے کی چیز جان کر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم مسلسل اپنی جہالت کے خلاف اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ ہم وقفوں وقفوں سے خود کو ٹھوکا لگا کر بیدار کرتے ہیں اور خیالی گھوڑے دوڑانے لگتے ہیں۔ ہم کسی بھی شے کے متعلق خیال ہی خیال میں خوب مزے لوٹتے ہیں ـــــ حیات بعد مرگ یا ایسے سوالات کے متعلق کہ جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ارسطو تک کو گڑبڑا دیا تھا جیسے یہ سوال کہ دوپہر تا آدھی رات تک چھینکنا کیوں خوش فال ہے جب کہ رات سے لے کر دوپہر تک بدفال ہے؟ سب سے بڑا مزہ جو بندگانِ خدا کے احاطۂ علم میں ہے، یہ ہے کہ علم کی تلاش میں جہالت کے اندر غوطہ لگایا جائے۔ بہرحال جہالت کا سب سے بڑا لطف، سوالات پوچھنے میں ہے وہ شخص جس نے یہ لطف گنوا دیا یا جس نے بے لچک عقیدے کے لطف سے اسے تبدیل کر لیا ہے جو فی الاصل جواب دینے کا مزہ ہے تو اس نے گویا ابتدا ہی میں تنگ نظری کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ ہم جو دوست ایسے متجسس آدمی پر رشک کرتے ہیں جو اپنی چھٹی دہائی میں علمِ عضویات کے مطالعہ کے لیے کمربستہ ہوا۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر اس عمر تک پہنچنے سے کہیں پہلے اپنی جہالت کی حس کھو چکے ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہم اپنے نہایت قلیل مقدار پر مشتمل علم کے متعلق جذبۂ افتخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بڑھتی ہوئی عمرِ رواں کو بجائے خود معرفتِ کل کا دبستان قرار دیتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ سقراط اپنی دانشمندی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی بنا پر مشہور ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہمہ بین و ہمہ دان تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ستر برس کی عمر میں اس کو اس بات کا عرفان ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک فلسفی نہ ہوتے ہوئے

کیا تم نے ایپکٹی ٹس[1] کا مطالعہ کیا ہے؟

"نہیں تو"

"ارے پھر تو تمہیں اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ وہ ٹامی ہے نا! پہلی بار مطالعہ کر رہا ہے اس کا ——— اور تشویشناک حد تک پُرجوش نظر آتا ہے۔"

مجھے اس مکالماتی گفتگو کی بھنبھناہٹ ایک ہوٹل کے لاؤنج میں ساتھ والی میز پر سے سنائی دی۔ لہٰذا میں بڑا مشتاق اور متجسس ہوگیا۔ کیونکہ میں نے ایپکٹی ٹس کو کبھی نہیں پڑھا تھا۔ ہر چند کہ میں نے اس کی تصانیف کو اکثر و بیشتر کتابوں کی الماری میں سجے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔ اور شاید میں نے اس کا کبھی حوالہ بھی دیا ہو ——— چنانچہ میں بڑا حیران ہوا کہ بالآخر مجھے ایسی عقل و دانش سے مملو کتابوں کا پتہ چل ہی گیا کہ جن کی تلاش میں زمانہ طالب علمی سے ہی میں سرگرداں رہا تھا۔ میں اپنے اس ابتدائی عقیدے سے کبھی دست کش

---

[1] EPICTETUS

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

نہیں ہوا ہوں کہ دانائی کہیں نہ کہیں کسی کتاب میں ضرور موجود ہے جسے اُسی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے جس سے گھونگا ریت میں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔ دانائی حاصل کرنے کا میں بھی اتنا ہی متمنّی ہوں جتنا کہ حضرت سلمانؑ تھے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دانائی لازماً ایسی صورت میں ہو کہ جسے بہ آسانی حاصل کیا جا سکے۔ یعنی ایسی دانائی جسے کسی وبائی مرض کی طرح پکڑا جا سکے۔ میرے پاس فلسفے کی تھکا دینے والی تلاش کے لیے نہ تو وقت ہے نہ ہمت! میری یہ تمنا ہے کہ فلسفی حضرات اپنی اس مشقت طلب تگ و دو کو جاری رکھیں اور انجام کار مجھے اپنی کاوشوں کے اثمار سے بہرہ مند کر دیا کریں۔ جس طرح میں کسان سے انڈے، پھل اگانے والے سے سیب اور دوا فروش سے ادویات لیتا ہوں۔ اسی طرح میں فلسفیوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ مجھے چند سکّوں کے عوض دانائی سے مالا مال کر دیں گے یہی سبب ہے کہ میں نے کبھی تو ایمرسن اور کبھی مارکس اور پلیٹو کو پڑھا اس توقع کے ساتھ کہ میں ان کا مطالعہ کر کے دانشمند ہو جاؤں گا۔ لیکن افسوس کہ میں دانشمند نہ بن پایا۔ اُن کو پڑھنے کے دوران میں ان کے فرمودات سے کُلّی اتفاق کرتا تھا۔ لیکن جب ان کو پڑھ چکتا تو کم و بیش ویسا ہی آدمی بن جاتا جیسا کہ ان کو پڑھنے سے قبل تھا —— یعنی ان اشیاء پر نگاہ مرتکز کرنے کے ناقابل کہ جن پر ان کے خیال کے مطابق مجھے توجہ مرکوز کرنا چاہیئے تھی یا پھر ان چیزوں کے بارے میں لاتعلقی پر کاربند کہ جن کے سلسلے میں ان کے نزدیک مجھے غیر جانب دار رہنا چاہیئے تھا۔ بایں ہمہ میرا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کتابوں پر سے ابھی ایمان نہیں اٹھا ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ کہیں نہ کہیں ایسے چھپے ہوئے مواد کا وجود ہے جس میں سے دانائی اور کردار کی شکتی کو میں بازوؤں والی ایک آرام دہ کرسی میں لیٹے ہوئے سگریٹ پینے کے دوران کشید کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہ اسی طبیعت کی ترنگ کا شاخسانہ ہے کہ میں نے ہوٹل کے لاؤنج میں ہونے والی گفتگو سننے کے بعد ایپکٹی ٹس کو پڑھنا شروع کیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اسے پڑھ کر میں نہایت پُرجوش ہو گیا۔ وہ اس نوع کا فلسفی ہے جسے میں پسند کرتا ہوں جو زندگی کو اس طور پیش نہیں کرتا کہ وہ اپنی بہترین صورت میں محض ایک ایسی دلیل لگے جسے پیچیدہ زبان میں بیان کیا گیا ہو، بلکہ دوسری اشیاء کے بیچ رہتے ہوئے وہ اس پہلو پر اظہارِ خیال کرتا ہے کہ آدمی کو روزمرہ کی زندگی کے معاملات میں کس طرح کا رویہ اپنانا چاہیئے — علاوہ ازیں جو کچھ اس نے کہا ہے مجھے اس ضمن میں تقریباً اس کی کہی ہوئی ہر بات سے اتفاق ہے۔ اذیت، موت اور افلاس سے بے اعتنائی — کافی پسندیدہ شے ہے۔ کسی بھی ایسے معاملے میں جس پر کسی کا بس نہ چلے فکرمند نہ ہونا چاہیے۔ چاہے یہ ظالم کی بربریت ہو یا زمینی زلزلوں کا خوف و خطر — اس مجبوری کے سلسلے میں بھی گویا ایپکٹی ٹس اور میں ہم خیال ہیں۔ تاہم اس مماثلت کے باوجود جو ہم دونوں کے خیالات میں نظر آتی ہے، میں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ جب میں یہ پڑھتا ہوں کہ ایپکٹی ٹس اپنے خیالات کو قائم رکھنے میں برحق تھا اور میں ہر چند کہ انھیں آرا کا قائل ہوں لیکن برحق نہیں ہوں تو میں ان آرا کو قبول کرنے کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باوجود عملی طور پر انھیں ایک لمحے کے لئے بھی بروئے کار لانے پر رضامند نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں موت، اذیت اور افلاس سچ مچ کے عفریت ہیں، سوائے اُس ایک لمحے کے جب میں آرام کرسی میں لیٹے لیٹے کسی فلسفی کی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہوں۔ اس دوران اگر فلسفے کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے زلزلہ آجائے تو ممکن ہے کہ میں فلسفہ کی کتاب کو پڑھنا بھول جاؤں اور صرف زلزلہ پر دھیان دوں اور لرزہ براندام دیواروں اور چھتیوں سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچوں اور یہ سب کچھ اس بات کے باوجود ہوگا کہ میں سقراط، پلینی اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کا نہایت پکا ثنا خواں ہوں۔ مانا کہ میں کرسی نشین فلسفی کی حیثیت سے اپنی جگہ مضبوط ہوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ بحران کے لمحات میں رُوح اور جسم دونوں ناتواں ثابت ہوتے ہیں۔

میں زندگی کی ادنیٰ چیزوں کے معاملہ میں بھی ایپکٹی ٹس مکتبِ فکر کے ایک فلسفی کی طرح خود کو تشفی نہیں دے سکا ہوں۔ تاہم مثال کے طور پر جب وہ اس بات کی نصیحت کرتا ہے کہ ہمیں کس طرح دیوتاؤں کے آگے بھینٹ چڑھانی چاہیئے۔ حتیٰ کہ دوپہر کا کھانا چھننے کی غیر تسلی بخش کارکردگی پر بھی ہمیں انتہائی حد تک صبر و تحمل سے کام لینے کی ضرورت ہے تو یوں لگتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ سب کچھ کہنے کا مطلب ایک روحانی کو اپنانے کے مترادف ہے لیکن جس کو شرفِ قبولیت بخشنا میری فطرت کے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب آپ کو گرم پانی کی حاجت ہو اور نوکر آپ کے حکم نہ دھرے یا اگر دھرے تو یوں کہ آپ کو نیم گرم پانی لا دے یا اگر وہ گھر ہی سے ہو تو آپ کو غصے سے اجتناب کرنا چاہیئے اور پھٹ نہیں پڑنا چاہیئے کیا یہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بات دیوتاؤں کے لیے قابل قبول نہیں ہے؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ کن پر حکمرانی کرتے ہیں ——— وہ جو آپ کے خویش و اقارب ہیں، فطری طور پر آپ کے بھائی بند ہیں اور یہ کہ وہ زیوس کے جگر گوشے ہیں۔ یہ سب حرف بہ حرف درست ہے اور مجھے ایسا آدمی بننے میں بڑی مسرت ہوتی جو کسی ریستوران میں بیٹھ کر بڑی بردباری اور فلسفیانہ انداز سے مسکرا سکے جب کہ بیرا تمام غلط چیزیں لے آئے یا سرے سے کچھ لانا ہی بھول جائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ صبر آزما حد تک انتظار کرنا مجھے مشتعل کر دیتا ہے۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا ہوں کہ مجھے مشروبات کی فہرست تین بار طلب کرنی پڑے۔ میں خاص طور پر اس وقت آگ بگولا ہو جاتا ہوں جب پون گھنٹے کی تاخیر کے بعد مجھے مطلع کیا جاتا ہے کہ سیلری SELERY ختم ہو گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں ایسے موقعوں پر کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کرتا۔ (مجھ میں ایسا کر گزرنے کا حوصلہ ہی کب ہے!) میں لعن طعن کا اتنا ہی قلیل مقدار میں استعمال کرتا ہوں جتنا کہ ایک فلسفی کرتا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ میرے اندر کی ہذیان بکنے والی روح میرے چہرے کے نقوش میں خود کو لازماً اجاگر کرتی ہے۔ واقعی میں خود کو یوں سمجھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ خدمت گار میرا رشتہ دار ہے یا یہ کہ وہ زیوس کی اولاد ہے۔ اگر وہ ایسا ہی ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ زیوس کی یہ اولاد خدمت گاری کے معاملے میں اتنی ہی نااہل ہو۔ ایپکٹی ٹس نے کبھی ریستوران میں کھانا تناول نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس بات کا امکان ہے کہ اگر وہاں اس کا صبر و تحمل اس کے کام آجاتا تو پھر مجھ میں اور ایپکٹی ٹس میں کتنا بعد القطبین ہوتا؟ اگر میں اتنے حقیر معاملات میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے شانت رویے کا تتبع نہیں کر سکتا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تو ایسی صورت میں یہ کہاں ممکن ہے کہ ہمیں زلزلوں اور ظالموں کی موجودگی میں ایک فلاسفر کا رول ادا کر سکوں ایک اور مقام پر جب ایپکٹی ٹس مال و متاع کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں اُن سے بے نیاز رہنے کی تلقین کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں ان کے چوری ہو جانے پر بھی قطعاً معترض نہیں ہونا چاہیے اُصولاً مجھے اس سے اتفاق ہے تاہم میں عملی طور پر اُس کی اِس بات کو تسلیم کرنے سے معذور ہوں۔ اس سے زیادہ حتمی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ایسا شخص جس کی مسرت کا دارو مدار محض اس کے مال و متاع پر ہو خوش و خرم نہیں رہ سکتا جب کہ مجھے کامل یقین ہے کہ ایک دانا آدمی قلیل روزینے پر بھی ہنسی خوشی گزر بسر کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایپکٹی ٹس کے مطابق یا میرے نقطہ نظر سے شادمانی کو زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ لیکن کم از کم ایپکٹی ٹس ثابت قدم رہنے والے ایک آئیڈیل پر بھروسہ تو کرتا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ہم اسے حاصل کر لیں گے بشرطیکہ ہم مادی اشیاء پر اتنی کم توجہ صرف کرنے لگیں کہ یہ ہمارے لیے اس حد تک کوئی مسئلہ ہی نہ رہیں کہ کوئی ان کو چرا لے جاتا ہے یا نہیں۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ اپنے لباس کی تعریف کرنا چھوڑ دو اور تم دیکھو گے کہ تمہیں اس شخص پر غصہ ہی نہیں آئے گا جو ان کو چرانے کا مرتکب ہوتا ہے نیز وہ چور کے سلسلے میں اپنی مسلسل فکرمندی کا اظہار اس پیرائے میں کرتا ہے:

"وہ اس بات سے نابلد ہے کہ آدمی کی اصل نیکی کن باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ تاہم اس کا گمان ہے کہ وہ عمدہ لباس کے حصول پر مشتمل

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوتی ہے، بالکل اسی قسم کی خوشی بھی کہ جس سے آپ خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔"

تو کیا ایسی صورت میں چوراچکے اٹھا نہیں لے جائیں گے؟ ہاں، منطقی حوالے سے میرا بھی یہ خیال ہے کہ اسے یہی کرنا چاہیے۔ اس سب کے باوجود میں اس لمحے ایسا نہیں سوچ سکتا جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ دعوت میں مدعو کوئی مہمان میرا نیا نویلا سرپوش اڑا لے گیا ہے اور اپنا سال خوردہ سرپوش اس کی جگہ چھوڑ گیا ہے۔ اس وقت خود سے یہ بات کہتے ہوئے مجھے قطعاً کوئی تسکین نہیں ملتی کہ:

"وہ نہیں جانتا کہ آدمی کی اصل نیکی کن باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ اس کا محض گمان ہے کہ نیکی میرا سرپوش حاصل کر لینے میں مضمر ہے۔"

نہ مجھے خود اپنے ہی گھر پر ہونے والی دعوت میں مدعو کسی مہمان سے اس قسم کی صورت حال کے پیش آنے پر ایسے ہمدردانہ فلسفہ پر مبنی اظہار کی جرأت کرنے کا سوچنا ہی چاہیے۔ نئے نویلے سرپوش کو یوں کھو دینا نہایت تکلیف دہ ہے بلکہ کچھ بھی گنوا بیٹھنا باعث آزار ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر کسی کو یہ شک ہو کہ اس کی چیز کو جان بوجھ کر اڑا لیا گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایپکٹی ٹس کی پیروی کر سکتا تھا بشرطیکہ میں ایک ایسی دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہوتا جہاں سرے سے کچھ وقوع پذیر ہی نہیں ہوتا لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں اشیاء نقصان، چوری چکاری یا کسی تکلیف کی وجہ سے تلف ہو جاتی ہیں، اور جہاں برے خدمت گاروں کے ذریعے بدمزہ کھانے بیشتر طعام خانوں میں بھیجے جاتے ہیں اور جہاں دیگر ہزاروں ناموافق چیزیں وقوع پذیر ہوتی ہیں تو ایسی حالت میں ایک عام

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آدمی کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ چہل قدمی والے جوتے پہن کر کوہ ہمالیہ کو سر کرنے کے لیے روانہ ہو جائے نہ کہ تمام عرصہ ایک فلسفی کی طرح آرام کرسی میں بیٹھ کر سوچتا اور زندگی بسر کرتا چلا جائے۔

اس سب کے باوجود ہم میں سے بیشتر یہ یقین کئے بنا نہیں رہ سکتے کہ فلسفی حضرات حق بجانب تھے ——— حق بجانب تھے کیونکہ وہ اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود اس بات کے مدعی تھے کہ بہت سی چیزیں جن کے متعلق ہم سر کھپاتے ہیں قطعاً اس لائق نہیں کہ ان کے متعلق تردد کیا جائے۔ سقراط کے بجائے اپنی حماقت پر یقین لے آنا نسبتاً سہل ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اسے سچ نہ مانے تو وہ یقیناً دنیا کا سب سے بڑا احمق ہوگا۔ کم و بیش سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ سقراط اور ایپکٹی ٹس جیسے لوگ خارجی اشیاء سے بے اعتنائی برتنے کے سلسلے میں حق بجانب تھے وہ لوگ بھی جو دس ہزار ڈالر سالانہ کما رہے ہیں اور مزید کمائی کے لئے کام میں جتے ہوئے ہیں، اس بات کو تسلیم کریں گے۔ تاہم اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم میں سے زیادہ تر لوگ چونک اٹھیں۔ اگر ہمارے دوستوں میں سے کوئی ایپکٹی ٹس کے فلسفہ پر کاربند ہو جائے۔ کیونکہ وہ شے جسے ہم اپکٹی ٹس کے ہاں دانائی متصور کرتے ہیں، اُسے اگر ایک واقف کار کے پائیں تو یقیناً اسے پاگل پن قرار دیں گے یا پھر شاید ایک واقف کار کے نہیں بلکہ کم از کم ایک قریبی رشتہ دار کے ہاں تو اسے سرور پاگل پن قرار دیں گے۔ کامل یقین ہے کہ اگر میں دولت، آسائش اور دیگر خارجی اشیاء کے سلسلے میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اتنا ہی لاتعلق ہو جاتا جتنا کہ ایپکٹی ٹس تھا۔ اور اس کے نقوشِ پا پر چلتے ہوئے نقب زنوں کے متعلق مسکرا مسکرا کر دلیل بازی سے کام لیتا تو ایسی صورت میں میرے معاملات اور بھی زیادہ پریشان کن ہو جاتے۔ چہ جائیکہ میں بہت زیادہ مادی فلسفے کا حامل ایک کامیاب نوعیت کا کمپنی کو بڑھاوا دینے والا شخص بن جاتا۔ مثال کے طور پر ایپکٹی ٹس کی اس چور اچکے کے بارے میں درج ذیل دلیل پر توجہ فرمائیے جس نے اس کے لوہے کا شمع دان چرا لیا تھا:

"اس نے خطیر رقم صرف کر کے ایک شمعدان خریدا تھا۔ اس ایک شمعدان کے لیے وہ ایک چور بنا۔ اس ایک شمعدان کی خاطر وہ بے ایمان ہو گیا، اس شمعدان کی بنا پر وہ بدکار کہلایا۔ اس میں کیا یہی چیز اُسے سُود مند نظر آئی؟"

دلیل بڑی معقول ہے تاہم نہ تو انفرادی طور پر اور نہ ہی اجتماعی حوالے سے ہم جائیداد کی اس تکذیب کو قبول کرتے ہیں۔ کچھ اشد لوگ ایسا ضرور کرتے ہیں، لیکن آغازِ کار میں وہ اپنے دوست احباب کے لئے نہایت پریشانی کا سبب ہی بنتے ہیں۔ جب دُنیا عام طور سے مسرور اور پُرسکون ہو تو ہم اس قولِ متناقص پر ایمان لے آتے ہیں کہ فلسفی حضرات دانا لوگ تھے، جب کہ ان کا تتبع کرنا سراسر حماقت ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ جہاں فلسفی قابلِ مطالعہ ہیں وہاں مادی اشیا قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم دانائی سے ایک ناظر کی حیثیت میں لطف اندوز ہوں۔ گویا یہ اسٹیج پر ہونے والا ایک ایسا خوش کن منظر ہے جس پر یلغار کرنے کی کوشش کرنا ناظرین کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لیے کارِ داد ہے۔ کیا یونانی اور رومی کسی مختلف قسم کی مٹی سے بنائے گئے تھے؟ کیا سقراط اور ایپکٹی ٹس کے ثنا خوانوں نے واقعی فلسفی بن جانے کی سعی کی تھی کیا وہ بھی ہماری طرح ہی دانائی کے حصول کے سلسلے میں پُرامید تھے عملی طور پر نہیں بلکہ اس آمرت دھارے کی مدد سے جو اُن سے زیادہ عقل مند آدمیوں نے مہیا کیا تھا؟ بغیر کسی کاوش کے دانشمند بن بیٹھنا مثلاً کسی آواز کو سن کر یا کسی کتاب کو پڑھ کر — یہ بیک وقت سب سے زیادہ ہیجان انگیز اور سب سے زیادہ تسکین بخش خوابوں میں سے ایک خواب تھا اور ایسے ہی ایک خواب میں میرا ابطا ایپکٹی ٹس سے ہوا اور دیکھو کہ وہ تو محض ایک خواب تھا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

رابرٹ لینڈ

کیڑے مکوڑوں سے نفرت کیوں؟

کہتے ہیں کہ موسم گرما کی مخصوص آواز کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ ہے۔ جب کہ موسم بہار کی امتیازی آواز طیور کی زمزمہ پردازی! عجیب بات ہے کہ لفظ کیڑا" ہمیشہ بدشورتی کے مفہوم کو منتقل کرتا ہے۔ ہم مکڑیوں کے متعلق غور کرتے ہیں کیونکہ بیشتر لوگ نازیوں سے بھی اتنے تو خوف زدہ نہیں ہیں جتنے کہ ان سے۔ ہم کھٹملوں اور پسوؤں کے بارے میں سوچتے ہیں جو اپنی غیر شائستگی کی بنا پر کمینے لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنتے ہیں، جب کہ نفیس لوگ ان کے ذکر اذکار سے پہلوتہی کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ہم کالے بھونروں کے بارے میں سوچتے ہیں کہ جب وہ اچانک باورچی خانہ کی بتی کے روشن ہونے پر تیزی سے سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے پناہ گاہوں کی طرف بھاگ اٹھتے ہیں — کالے بھونرے (جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے) اول تو وہ بھونرے ہی نہیں ہیں اور دوئم ان کا رنگ بھی سیہ نہیں ہے۔ ایسی خواتین بھی ہیں جو ان میں سے کسی ایک مخلوق کا محض نام لینے پر بڑا سا منہ بنالیں گی۔ ہم میں سے وہ لوگ جنھوں نے کم از کم مکڑیوں اور کالے بھونروں کے خلاف — اس قسم کی کراہت کو

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کبھی محسوس نہ کیا ہو، اس چیز کو سمجھ نہیں پائے اور سوچتے ہیں کہ یہ کس حد تک خلافِ فطرت ہے۔ کیا یہ چیز کچھ لوگوں میں پیدائشی طور پر ہوتی ہے، چوہوں سے خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہو جانے والی پرانی عادت کی طرح جو محض اخذ کردہ ہے؟ جب میں نے کالے بھونرے کو دیوار کے نیچے غائب ہونے کی کوشش میں بلی کا تر نوالہ بنتے ہوئے دیکھا ــــ تو اس کیفیت سے قریب ترین ہونے کا لمحہ کراہت کے اسی احساس پر مشتمل تھا۔ اسی قبیل کی اور بھی متعدد رینگنے والی مخلوقات کا وجود ہے جو غلاظت کی اولاد ہونے کی حیثیت میں اس قدر بدنام ہیں اور ان کا لمس اتنا خوفناک ہے کہ ہم قدرتی طور پر ان سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ برنز BURNS کسی خاتون کے بالوں میں رینگنے والی جوؤں پر مسرت کا اظہار کر سکتا ہے لیکن ہم سے کوئی بھی طمانیتِ قلب کے ساتھ جوؤں کی نوع کا سامنا نہیں کر سکتا، چاہے وہ خنزیروں کی پشت پر ہی کیوں نہ ہوں۔ سائنس دان اس بات کو نہیں مانتے کہ جوؤں کو غلاظت سے کوئی خطرہ ہے، بلکہ وہ تو بلاشبہ غلاظت ہی میں پھلتی پھولتی ہیں۔ پستوؤں کے خلاف ہماری برافروختگی کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم انھیں غلاظت سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ ڈان نے ایک ایسی خاتون کو ایک نظم لکھ کر بھیجی جسے اُس پستو نے کاٹا تھا، ں کا وہ خود بھی نشانہ بنا تھا ــــ اور کہا کہ یہ معقول سبب ہے کہ وہ خاتون سے وصل کی اجازت عطا کر دے۔ یہ اس وقت بھی اور آج بھی ایک لغو نظم رہوتی ہے۔ محبت چاہے وہ دل پھینک کثیر الازدواجی قسم ہی کی کیوں نہ ہو سے ایسے تصورات کی مدد سے بیان نہیں ہونا چاہیئے۔ فقط بدشعوری کی پرشباب

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بدعت کے زیرِ سایہ بڑھنے کے دوران بھی کوئی شاعر ایسی ریاکارانہ بات کہہ سکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق پستو جست بھرنے کی شکتی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے اور اس اعتبار سے قریب قریب محبت عالم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اسے آدمی کے دل یا تصور میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔ ایسے بے شمار لوگ بھی گزرے ہیں جو پستوؤں کے معاملے میں بے اعتنائی برتتے تھے۔ البتہ ایسے افراد کا وجود عنقا ہے جو ان سے محبت کرتے ہوں۔ تاہم اگر میری یادداشت مجھے دھوکا نہیں دے رہی تو چند برس قبل کا قصہ ہے کہ ایک مشہور و معروف فرانسیسی قیدی نے ایک پستو پال کر اور کرتب بازی کا مظاہرہ کرنے کے قابل بنا کر اپنے بندی خانہ کی کوفت کو بھلانے کی کوشش کی تھی۔ پوری دنیا کے لیے پستو فقط نفرت انگیز جھلاہٹ کی ترجمانی کرتا ہے۔ مسٹر ڈبلیو۔ بی ییٹس نے اپنی شاعری میں اسے ایک ایسے منظوم چٹکلے میں پیش کیا ہے جس کا مخاطب ایک ایسا شاعر ہے جس نے یہ چاہا تھا کہ میں بُرے شاعروں (جو اس کے اور میرے مقلدین ہیں) کی تعریف و توصیف کروں: ؎

تم کہتے ہو کہ میں نے ہمیشہ دوسروں کے کہے
یا گائے ہوئے کی تعریف کی ہے
خیر یہ تو دانش مندی کا تقاضا تھا
مگر مجھے بتاؤ
کہاں ہے ایسا کوئی سگِ آوارہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جس نے کبھی اپنے پستوؤں کی ستائش

کی ہو؟

جب ہم بنی نوعِ انسان نیز اپنے سامنے موجود جانوروں کے اس دُکھ کے بارے میں سوچتے ہیں ——— (اگر دُکھ موزوں لفظ ہے تو) جو انہوں نے کیڑے مکوڑوں کے ہاتھوں جھیلا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ کافی حد تک قابلِ معافی بات ہے کہ ایسی فقیر مخلوق کا منہ چڑایا جائے تاہم یہ بات دل کو لگتی ہے کہ وہ کیڑے مکوڑے جو آدمی کو زیادہ ضرر پہنچاتے ہیں، ان میں سے نہیں ہیں جو اسے بالعموم زیادہ دہشت زدہ کرتے ہیں۔ ایک خاتون بڑی حوصلہ مندی سے اپنی جگہ پر بیٹھی رہے گی جب کہ ایک بھڑ ہوا میں منڈلاتی ہوئی پہلے اس کی دائیں کنپٹی اور پھر بائیں کنپٹی کا معائنہ فرماتی ہے۔ مگر یہی خاتون ایک بے ضرر مکڑی سے ڈر کر ایک کوس تک بھاگتی چلی جائے گی جب کہ کوئی دوسری محترمہ گھوڑا مکھی کی موجودگی میں اپنے حواس بحال رکھے گی، لیکن ایک معصوم پتنگے کو دیکھتے ہی کانپ اٹھے گی۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہمارے خوف محض جسمانی خطرے کے احساس کے نتائیدہ نہیں ہیں۔ ایسے کیڑے مکوڑوں کا وجود بھی ہے جو ہمیں اس چیز کا احساس دلاتے ہیں کہ ہم خوف و ہراس کی فضا کے حصار میں ہیں۔ میں اکثر پتنگوں کے حوالے سے یہی محسوس کرتے ہیں۔ پتنگے حشرات الارض جہان کی بدروحیں ہیں۔ غالباً وہ انداز جس سے وہ بغیر اطلاع دیے، رات اندر سے پھڑپھڑاتے ہوئے آتے ہیں ہمیں خوف زدہ کر دیتا ہے وہ روشن کھڑکیوں پر یوں دستک دیتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے جیسے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باہر کی تاریکی ہمیں کوئی پیغام نہیں بھیجتی۔ ہم تو یہ دیکھ کر پتنگوں کی ثابت قدمی اس دہشت کو فزوں تر کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ وہ ایک محکوم قوم سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ وہ ایک ضدی زن بیوہ سے زیادہ ضدی ہوتے ہیں لیکن وہ سب سے زیادہ دہشت انگیزی کا سامان اس وقت پیدا کرتے ہیں جب ان کی پتلیاں روشنی کو چھوتے ہی لال انگارہ بن جاتی ہیں۔ ایسے میں انسان کو افریقہ کے کسی جنگل میں واقع مندر میں رات کو ادا کی جانے والی رسومات اور کالی دیوی کے (ماتھے) پر دہکتے ہوئے خوفناک تیسرے موتیوں کا خیال آتا ہے ـــــ وہ تیسرے موتی جنھیں کسی عاقبت نااندیش سفید چمڑی والے کو چرانا ہوتا ہے تاکہ وہ بعد ازاں کسی سنسنی خیز ناول میں نسلی انتقام کا موضوع بن سکیں۔ میرا یہ احساس ہے کہ ایسی صورت میں اگر جسم کے رونگٹے اپنے آخری سروں تک بھی کھڑا ہو جائیں تو بھی وہ اس میں حق بجانب ہوں گے۔ گو میں جانتا ہوں کہ رونگٹے اس قسم کا کام انجام نہیں دیتے۔ میرے خیال میں پتنگے کی آنکھ کا نظارہ کرنا زیادہ تر لوگوں کے لیے ایک ناممکن سی بات ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے انسان بھلا نہیں سکتا۔ بعینہٖ جیسے وہ ایک جلتے ہوئے مکان کو فراموش نہیں کر سکتا۔ پتنگوں کے بارے میں ہمارے احساسات جو بھی ہوں، یہ بات حیران کن ہے کہ ضعیف الاعتقادی نے پتنگے کو مرے ہوؤں کی دنیا سے اتنا منسلک نہیں کیا۔ جتنا کہ تتلیوں کو ـــــ کون کہتا ہے کہ گوبھی کی کاشت کرنے والا تتلیوں کے خلاف کوئی جذبۂ عداوت رکھتا ہے اور اس کے باوجود لوک کہانیوں میں پروانے کے بجائے تتلی کو بھوت پریت

www.urduchannel.in

ایسا کردار تفویض کیا گیا ہے۔ آئرلینڈ میں ایک پادری کے بارے میں یہ روایت عام ہے کہ وہ اس بات پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا کہ انسانوں کی روحیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن (اپنی رائے تبدیل کرنے کے بعد) اس نے اعلان کیا کہ جب وہ مرے گا تو اس کے بدن سے ایک جاندار ہستی اوپر کو اڑتی ہوئی دیکھی جا سکے گی ـــــ یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ اس کا تشکیک پر مبنی سابقہ رویہ غلط تھا چنانچہ جب وہ مرا تو ایک دلکش مخلوق برف ایسے چار سفید پروں کے ساتھ اس کے بدن میں سے اوپر کو اٹھی اور پھر اس کے سر کے گرد پھڑ پھڑانے لگی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ اوّلین تتلی تھی جو آئرلینڈ میں دیکھی گئی تھی۔ اور اب تمام بندگانِ خدا اس بات سے آگاہ ہیں کہ تتلیاں مرے ہوؤں کی ارواح ہیں جو اس لمحے کے انتظار میں ہوتی ہیں کہ کب انھیں "اعراف" میں داخل ہونے کا اجازت نامہ حاصل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سلمان جزائر میں یہ ایک ریت ہوا کرتی تھی کہ جب کوئی قریب المرگ ہوتا تو اس کا یہ فرض ہوتا کہ وہ اعلان کرے کہ اس کی تتلی میں قلبِ ماہیت ہونے والی ہے۔ بعد ازاں جب اس کے اہلِ خانہ کا کسی تتلی سے واسطہ پڑتا تو وہ وضاحت کرتے کہ یہ "پاپا ہیں" اور اس کی خدمت میں ایک عدد ناریل پیش کرتے۔ ایک انگریز گھرانے کے افراد اس قسم کے حالات و واقعات سے دو چار ہونے کی صورت میں غالباً یہ کہیں گے: "لیجئے کیلا پیشِ خدمت ہے۔"

افریقہ کے کئی ایک قبائل میں مرے ہوؤں کے متعلق یہ مانا گیا ہے کہ ان کی واپسی تتلیوں اور گھریلو مکھیوں کی شکل میں ہوتی ہے اور اس بنا پر وہ بھی انھیں ہلاک نہیں کرتا۔ دوسری طرف ویسٹ انڈیز میں تتلیاں

www.urduchannel.in

وہ کردار ادا کرتی ہیں جو دیگر ممالک میں قربانی کے بکرے کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ فروری میں سینٹ پیٹر والے دن کے موقع پر بھجن اور مذہبی رسم کے ساتھ اسے سرِ عام ملک بدر کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں پر جیسے سیمویا میں (مجھے نہیں معلوم کہ کہاں سے مجھے یہ تمام حقائق دستیاب ہوئے ہیں: غالباً شاخِ زرّیں[1] میں سے ملے ہیں) ——— لوگ تتلی سے اس طرح خوف زدہ ہوتے ہیں جیسے کسی دیوتا سے اور تتلی کو پکڑنے کا مطلب فوری موت سے دوچار ہو جانے کا خطرہ مول لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، پتنگا بھی شاید اس جیسی لاتعداد کہاوتوں میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے، لیکن یہ اس سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تاہم ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بہت سی کہاوتوں میں پتنگے اور تتلی کا باہمی فرق واضح نہیں ہے۔ ہم میں سے بہت سوں کے لیے بظاہر ان دونوں کے باہمی فرق کو جان لینا کافی آسان ہے۔ مثال کے طور والا یتی تتلی ہمیشہ اپنے ڈنڈا نما سینگوں کی وجہ سے پہچانی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ امتیازی وصف تتلیوں کے باقی سارے خانوادے میں کارفرما نہیں ہے ——— یہ خانوادہ اس قدر بھرا پڑا اور متنوع ہے کہ تیرہ ہزار انواع پہلے ہی ڈھونڈی جا چکی ہیں اور ماہرینِ حشرات الارض پُر اُمید ہیں کہ کسی دن وہ ان سے دُگنی تعداد سے بھی زیادہ کی درجہ بندی کر سکیں گے۔ ان جزاٹر میں بھی واقعی ہم میں سے اکثر غالباً ایک پتنگے کی پہچان اس کے ڈنڈا نما سینگوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے نہیں کر پاتے۔ ہمارے لیے یہ ایک ایسی شے ہے جو رات کو پرفشاں ہوتی ہے اور ہمارے طبوستا

[1] GOLDEN BOUGH

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کو کتر کتر کر ان میں سوراخ پیدا کر دیتی ہے۔ تاہم اس سے ہم تمام حالات میں خوف زدہ نہیں ہیں۔ ہمارا ڈر ایک داخلی خوف ہے۔ شاعری میں ہمارے اس کے ساتھ خوش گوار روابط ہیں اور ہم اس سوچ سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ ؎

پتنگا ستارے کا آرزو مند ہے

ہمیں یاد آتا ہے کہ یہ پروانوں کا وجود ہے کہ جس کے باعث رات کو پیلے رنگ کی یاسمن اتنی بھینی بھینی خوشبو سے ہم کنار ہوتی ہے۔ ہمارے اذہان میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ جب ہم یہ پڑھتے ہیں : ؎

اور جب سفید پتنگے پرواز کناں تھے
اور پروانوں ایسے ستارے شمار ہے تھے
تو میں نے بیری کا پھل ندی میں پھینکا
اور ایک ننھی منی چمکدار ٹراوٹ مچھلی پکڑ لی

کسی شخص نے کبھی مکڑیوں یا کنکھجوروں یا ہمارے کسی دوسرے پالتو دشمن کیڑوں کی شان میں گیت نہیں گایا ہے۔ پتنگا کیڑے مکوڑوں میں وہ واحد کیڑا ہے جو ہمیں بیک وقت اپنی خوبصورتی اور اپنی دہشت کی بنا پر متوجہ کرتا ہے۔

میرا نہیں خیال کہ پہلے کبھی کیڑے مکوڑوں کے اتنے زیادہ جتھے اس دیس میں دیکھے گئے ہوں جتنے کہ گزشتہ موسم بہار میں۔ یہ واحد شکوہ ہے جو مجھے سورج سے کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ وہ کیڑے مکوڑوں کی بے محابا افزائش کرتا ہے،

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بلکہ وہ ان کی افزائش نسل ایک طفیلی کے مانند خاندانوں کی صورت میں نہیں بلکہ طاعون کی شکل میں کرتا ہے۔ محض کیڑے مکوڑوں کے وجود کا تصور ہی ہمیں خطا ستوا کے خطوں، ان کے نیلگوں آسمانوں اور پُر تمازت سورجوں پر رشک کرنے سے باز رکھتا ہے۔ لہٰذا ٹڈیوں کے جمِ غفیر کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ انسان قطب شمالی پر جا کر رہے۔ ہم تارنتولا TARUNTULA سے تو خوف زدہ رہتے ہیں مگر سی سی TSE. TSE مکھی کے لئے گوشۂ محبت بھی نہیں رکھتے۔ ہمارے اپنے ماحول کے حشرات الارض بہ طور قابل نفرت ہیں۔ مثلاً گھاس کے طوطے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قاتل ہے۔ تاہم کن گوجر ایک مکمل ماں ہے جب کہ دوسرے کیڑے مکوڑوں مثلاً بھونروں کی وجہ شہرت یہ ہے کہ وہ پدر کش ہیں۔ تاہم وہ خطرناک ہوں یا نہ ہوں، کیڑے مکوڑے بحیثیت مجموعی دق کرنے والے اور تباہ کن ضرور ہیں۔ سبز مکھی گلاب کے پھول کے اندر بستیاں آباد کرتی ہے۔ ایک قرمزی کیڑا سیب کے پتوں تلے اپنا گھر بساتا ہے اور ایک اور بدمعاش جو شب دیجور کی طرح کالا ہے، لوبیے کے دانوں کے اوپر رقص کرتا ہے۔ اتنی بیماریاں تو انسانی جسم میں بھی نہیں ہیں جتنی کہ فقط ایک پھل دار درخت پر کیڑوں کی اقسام ہوتی ہیں۔ سیب جو پکنے سے پہلے گل سڑ جاتا ہے ایک سڑے ہی کا شاخسانہ ہے اور اگر آلوچے سبز ہو کر اور وقتِ معینہ سے پیشتر بیسیوں کی تعداد میں زمین پر آن گریں تو ایک بار پھر اس کا سبب ایک کیڑا ہی بنتا ہے جو ان سب کے درمیان اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔

اب جرمن جاسوسوں کا ذکر ہو جائے! اگرچہ جرمن جاسوس (جاسوسی کا) سبق

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سیکھنے کی غرض سے حشرات الارض کی دُنیا کی طرف رجوع کرتے تو شاید وہ
اس طرح کے غیر مستعد اناڑی ثابت نہ ہوتے۔ ہم میں سے اکثر بیک وقت
جاسوسوں اور کیڑے مکوڑوں سے ایک جیسی وجوہ کی بنا پر نفرت کرتے ہیں۔ ہم
ان کا شمار ان ضرر رساں جانداروں میں کرتے ہیں جو ایسی جگہ دخل اندازی کے
مرتکب ہوتے ہیں جہاں داخل ہونے کا انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا، جو ہمیں اپنا
ہدف بناتے ہیں اور برائی کے سوا ہمیں کچھ نہیں دیتے۔ چنانچہ ہم ان کے
مقابلے میں بے دردی کا مظاہرہ کرتے ہیں: "کیڑے مکوڑے" اور پھر ان کا قلع قمع
کر دیتے ہیں۔ انسان کو کیڑا مکوڑا شمار کرنے کا مطلب ہمیشہ پشیمانی کے بغیر
اس کے ساتھ سلوک روا رکھنے کی جانب پہلا قدم ہے۔ یہ ایک خطرناک رویّہ ہے
اور زیادہ قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ وہ انصاف کے برعکس مجرم پر منتج ہوگا۔ میرا
ایقان ہے کہ آج تک کوئی ایسی سلطنت معرضِ وجود میں نہیں آئی کہ جس کے
کسی نہ کسی دَور میں باغی عوام الناس کے نزدیک بچوں کا قتلِ عام اس بنیاد پر
قابلِ معافی شمار کیا گیا ہو کہ "بچے جوئیں پیدا کرتے ہیں"۔ اس میں کوئی شک نہیں
کہ بظاہر بہت سے قدامت پسندوں کے نزدیک بالشویک کو نیست و نابود کرنا
اسی حفظانِ صحت کا اصول ہے جیسا کہ مکھی کو نیست و نابود کرنا۔ حتیٰ کہ تصویروں کے
بارے میں بھی، ہم میں سے زیادہ تر ان کی بیچ کنی میں پس و پیش کا اظہار کر سکتے ہیں
جبکہ سے ہزار نفرت کریں اور ان کی کامل تباہی کے آرزومند ہوں، ہم ہو لے
سے ایک ایک پر اور ایک ایک ٹانگ کر کے، ان کو پرزہ پرزہ نہیں کر سکتے،
لہٰذا بالی بچوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لوگ مکھیوں کو ان لیس دار کاغذی ٹکڑوں پر آہستہ آہستہ موت کے حوالے ہوتے ہوئے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے، جن پر مکھیاں اپنی ٹانگیں گھسیٹتی گھسیٹتی مرکھپ جاتی ہیں ——— جو بری نظروں میں کمینگی پر مبنی بربریت ہے۔ ایک ممتاز ناول نگار کا کہنا ہے کہ مکھیوں کو کاغذ پر سے یکے بعد دیگرے اپنی ٹانگوں کو کھینچ کر آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھنا، یہاں تک کہ وہ اپنے فطری قد سے دگنی ہو جائیں، اس کا ایک دل پسند شغل ہے۔ مجھے اس کی اس بات پر یقین کرنے میں کبھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ مکھیوں کے معاملے میں پاسداری (اگر بالفرض اسے رحم دلی نہ بھی کہا جائے) کو عام گفتگو کی ملامت کا میزان قرار دیا گیا ہے۔ کتنی ہی بار کسی مرے ہوئے شخص کی تعریف میں یہ سننے میں آیا ہے کہ:

"اسے تو مکھی تک کو تکلیف پہنچانا گوارا نہ تھا!"

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو مکھیوں کو ضرر پہنچانے کے مرتکب ہوتے ہیں تو ہم تاریخ میں ان کی تذلیل و تشہیر کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ڈومی شین DOMITIAN کی سفاکی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ سٹیونیس SUETENIUS ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ اپنے عہد سلطنت کے ابتدائی ایام میں وہ بلا ناغہ گھنٹوں کسی گوشۂ تنہائی میں مکھیوں کو دبوچنے اور ایک تیز دھار قلم سے انھیں نشانہ بنانے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ نتیجتہً جب کسی نے ایک مرتبہ استفسار کیا کہ آیا سیزر کے ساتھ وہاں کوئی اور بھی موجود تھا تو والی لبس کریپس کا بذلہ سنجی سے مملو جواب تھا کہ "ایک مکھی تک نہیں"۔ اور جیسے کہ ہم میں سے بیشتر ڈومیشین

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے مقابلے میں مکھی کے تابیتی ہیں، اسی طرح ہم میں سے اکثر مکڑی کے مقابلے میں مکھی ہی کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمیں مکھی کی حالتِ زار پر رحم آتا ہے جیسے وہ (اگر یہ تصور قابلِ قبول ہے تو) محض ایک زیرِ عتاب کُتیا ہو۔ ادنیٰ نوعیت کی گرگوالی کیفیات میں سے سب سے زیادہ اذیت ناک کیفیت جس کا انسانیت کے علم بردار کو سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ ہے کہ آیا وہ مکڑی کے جالے کو برباد کرے اور یوں امکانی حد تک مکڑی کو بھوکوں مار دے یا اس کے عنکبوت کو اسی حالت میں چھوڑ دے اور یوں سینکڑوں مکھیوں کی ہلاکت کا باعث بن جائے۔ میں ایک عرصے سے اس قسم کے معاملات میں فطرت کو اس کی کارکردگی کے ضمن میں آزاد چھوڑ کر مطمئن ہو چکا ہوں ——

—— میں یہ نہیں کہتا کہ میں فطرت کو اس کی جملہ کارروائیوں کے سلسلے میں پسند کرتا ہوں۔ تاہم میں اس بات کو تسلیم کر کے مطمئن ہو جاتا ہوں کہ غالباً اس کی وجہ اس سلسلے کے حقائق سے میری لاعلمی ہے۔ جب کہ دوسری طرف فطرت میں تباہ و برباد کرنے کے جو عوامل ایسے بھی ہیں جو مجھے اظہارِ اختلاف پر مائل نہیں کرتے بلکہ اُلٹا مجھے محظوظ کرتے ہیں۔ ان میں ایک اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب تھرش[1] ایک گھونگے کو کھا جاتا ہے۔ اس کے خول کو ایک پتھر کے اوپر زوردار ضربوں سے بار بار مار کر۔ میں نے گھونگے کے نقطۂ نظر سے اس حادثے کے متعلق کبھی غور و خوض نہیں کیا۔ پتھر پر گرنے کی کھٹا کھٹ کو سنتے ہوئے میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ کوئی راگ ہو۔ اگلے روز میں نے اسی طرح کی خوشی کی

[1] یورپ کا ایک خوش الحان پرندہ (طوطی)

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک سنسنی سی محسوس کی، جب میں نے ایک چتی دار خوبصورت چڑیا کو دو سیپوں کے درمیان ایک قسم کے رس چوسنے والے کیڑے کو اطمینان سے کھاتے ہوئے دیکھا جو پھل کو کترتے ہوئے اس کے اندر اتر رہا تھا۔ چتی دار چڑیا، تتلی اور مدھ مکھی ـــــ ایسی مخلوقات کو کون پابہ زنجیر کر سکتا ہے۔

ایسے کیڑے مکوڑے بھی ہیں جو لازماً سانپ سے قبل باغ عدن میں موجود ہوں گے۔ ان دنوں دیگر حشرات الارض کے دیوتا بلیزی بب BLEEZEBUB کی کوئی خطرناک شکستی ابھی روئے زمین پر کارفرما نہیں تھی، جب عام پھول اتنے ہی عجیب تھے جتنے کہ کیڑے مکوڑے اور تمام کیڑے مکوڑے اتنے ہی خوبصورت تھے جتنے کہ پھول!

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جی۔ کے۔ چسٹرٹن

نوجوان نہ رہنے کے مزے

اَدھیڑ عمر سے بڑھاپے کے مدار میں داخل ہونے کے گوناں گوں فوائد ہیں، جن کا شاذ ہی شوخ بُوجھ سے ذکر ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا ذکر ذرا جذباتی سا ہو کر کیا جاتا ہے۔ ایک عمومی ردِّ عمل اس ضمن میں یہ ہے کہ تمام بوڑھے مرد حضرات کرسمس فادر کی طرح ایک حد درجہ برف ایسی سفید براق ریش مبارک سے لیس ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نسطور کی طرح دانائی کے بے محابا اظہار میں مسرت بھی محسوس کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں نے نوجوان نسل کو پیرانہ سالی کے کھرے اور سچے فوائد کے بارے میں بدظن کر دیا ہے اور انھیں بڑھاپے کے فوائد کا سچا بیان ناقابلِ فہم نظر آنے لگ گیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ بوڑھے حضرات بالآخر دانا ہو جاتے ہیں کیونکہ آدمی کو عقل مشکل ہی سے آتی ہے۔ اس لیے بھی کہ بیشتر بوڑھے حضرات ایک نہایت پُرکشش طفولیت اور پُرمسرت معصومیت کو قائم رکھتے ہیں۔ بوڑھے لوگ اکثر و بیشتر نسبتاً کم عمر حضرات سے کہیں زیادہ مینشک ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو نسبتاً زیادہ مہم جو بھی اور پھر انھیں اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی قطعاً کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی ڈھیر ساری

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چیزوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا اس ضرب المثل میں رتی بھر کھوٹ شامل نہیں کہ "ایک بوڑھے احمق سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں ہے"۔ شاید کہیں بھی کسی ایسے بے وقوف کا وجود نہیں ہے جو اپنی نجی "احمقوں کی جنت" میں آدمی خوشی سے بھی رہ رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ بالکل بجا ہے کہ پختہ سالی کی تعریف میں جن دلائل کی عام طور پر تشہیر کی جاتی ہے فی الحقیقت وہ ایسے نہیں ہیں جیسے کہ بظاہر سچائی پر مبنی نظر آتے ہیں اور بالفرض اگر انھیں واقعی آشکار کر بھی دیا جائے تو یہ ہمیں بالکل ایک مضحک تضاد کے مانند معلوم ہوں گے۔

مثال کے طور پر ایک خوشی جو بڑھاپے سے وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں پہلے سے نسبتاً کم عمر زیادہ تر و تازہ اور کچھ زیادہ ہی جاندار سی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یوں گویا ایک طرح سے ہم ان کی اہمیت سے آگاہ ہونے لگتے ہیں یا بہ الفاظِ دیگر ہم زندگی کو ان جملہ روایات، اداروں، نظریات اور اخلاقیات کے پیکروں میں دیکھنے لگتے ہیں جنھیں ہم نے جوانی کے ایام میں مُردہ تصور کیا تھا۔ ایک نوجوان مرد ایسی دنیا میں پلتا بڑھتا ہے جو اسے اکثر و بیشتر ناقابلِ برداشت حد تک سال خوردہ نظر آتی ہے۔ وہ ایسی ضرب الامثال اور افکار کی فضا میں ہوش سنبھالتا ہے جو بڑی حد تک سنگلاخ اور بے حس ہوتے ہیں نیز وہ خود کو پامال چیزوں کے درمیان کچھ اس طریقے سے حنوط کیا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے حیات آفریں دانۂ گندم کے بجائے موت کے سنگریزے اس کی جھولی میں ڈال دئے گئے ہوں یا پھر اسے مُردہ ماضی کی راکھ سے نواز دیا گیا ہو تاکہ وہ شہرِ خموشاں میں جیون بِتا سکے۔ مانا کہ یہ انتہائی فطری غلطی ہے لیکن بہرحال

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

غلطی تو ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر رواں کی خوبی اس دریافت میں ہے کہ عام روایات سچی اور اسی لئے زندہ ہیں اور واقعی کوئی روایت اس وقت تک روایت نہیں بن پاتی جب تک وہ سانس نہ لے رہی ہو۔ اس بات کو جان لینے میں بڑا لطف ہے کہ دنیا محض اس لئے پامال ضرب الامثال کو نہیں دہراتی کہ وہ مثالی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ عملی ہیں۔ مثلاً جب تک میں نے ایک حد تک نہیں پالا تھا مجھے اس ضرب المثل کا معنی معلوم نہیں تھا کہ "سگِ خفتہ" کو سویا ہی رہنے دینا چاہئے۔ نہ ہی اس کہاوت کا مفہوم معلوم تھا کہ "نہ کریں گے نہ کرنے دیں گے"۔ یہ تمام مُردہ ضرب الامثال مجھے اب کافی جاندار لگنے لگی ہیں کیونکہ اب یہ میرے خیال میں عملی نفسیات کا جزو بن گئی ہیں۔ اس سے قبل میں مضافات میں جتنا عرصہ قیام کرتا تھا مجھے اس مقولہ یعنی "یہ ایک ایسی ضرر رساں آندھی ہے جس سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا" کے مطلب کو جاننے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب یہ معقول بلکہ تیکھا سا مقولہ مجھے ایک چلبلا فقرہ معلوم ہوتا ہے جو باغ کے صدر دروازے پر میرے کسی دیرینہ دوست نے مجھ پر کسا ہو۔ یہ سب کچھ ایسا ہے جیسے ہنستی بستی دنیا میں نمایاں اشیاء کے درمیان جیا جائے نہ کہ مُردہ اور پیش پا افتادہ چیزوں کے بیچ زندگی بسر کی جائے۔ دراصل یہ تو نوجوانی کی بغاوت ہے۔ (سچی بغاوت بھی ہو سکتی ہے) جو گرد و پیش کے ماحول کو مُردہ اور بے معنی ظاہر کرتی ہے۔ یہ تو عہدِ پیری ہے (جسے دوسرا بچپن بھی کہا جا سکتا ہے) جس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہر شے کی اپنی معنویت ہے نیز یہ کہ خود زندگی کبھی موت سے ہم کنار نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ہم نے ابھی ابھی چائے کے پتے کی ایک ایسی حیرت انگیز کروٹ دیکھی ہے جس نے تمام تر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جدید مادی تفاخر اور خوش حالی کو متعطل کر دیا ہے۔ امریکہ جو ایک یا دو برس قبل طلائی شہروں سے مزین ایک وسیع ایلڈوراڈو ELDORADO تھا۔ اب تقریباً اتنا ہی گڈمڈ ہو گیا ہے جتنا کہ برطانیہ بلکہ سچ پوچھئے تو آئرلینڈ سے بھی کہیں زیادہ مشکل میں پڑ گیا ہے۔ صنعتی ممالک درحقیقت صنعتی ہونے کو مشکل تصور کر رہے ہیں، جبکہ قدیم زرعی ممالک ہنوز یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سخت جان ہو سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ میری پیش گوئی ہے یا مجھے ایسا ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ اکثر ایک شخص کسی چیز کو بوجھ شی گھٹیا کہہ دیتا ہے بغیر یہ سوچے سمجھے کہ وہ واقعی گھٹیا ہے بھی کہ نہیں۔ بے شک ایسی بات کی کسی نوجوان، ترقی پسند، خوشحال اور مہم جو سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ساری تاریخ اور ثقافت، ضرب الامثال اور پیش گوئیوں سے بھری پڑی ہے جو مجبور کرتی ہیں کہ انھیں تسلیم کیا جائے۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ باگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرب الامثال اور تاریخ حد سے زیادہ ثقیل ہے اور پھر خود مجھے اور میرے نوجوان دوستوں کو بھی اوائل عمری ہی سے بار بار اور ایک جیسے تسلسل سے یہی باور کرایا گیا تھا کہ قسمت متلون مزاج ہے"۔ دولت کے بال و پر ہوتے ہیں اور وہ اڑتی ہے۔ طاقت ملک جھٹکے میں طاقت ور سے چھن جاتی ہے، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور گستاخی دیوتاؤں کے عتاب کا موجب بنتی ہے لیکن ہمارے لیے یہ سب کچھ اس وقت بے معنی تھا اور تمام ضرب الامثال ہمیں پرانی دقیانوسی اشیاء کے لیبلز پر جمی دھول کی طرح کھردری اور باسی معلوم ہوتی تھیں۔ ہم نے ولزلے کے زوال کے بارے میں سن رکھا تھا جو ایسے ہی تھا جیسے کوئی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

عظیم الشان محل محلے کے ساتھ زمیں بوس ہو جاتے اور جس کے گرنے کی آواز اب بھی عہد بہ عہد سنائی دے رہی ہے۔ ہم نے یہ کہانی شیکسپیئر کے لفظوں میں پڑھی تھی جو غلباً شیکسپیئر کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ ہم نے انھیں پڑھا تھا مگر خود ان سے کچھ سیکھا نہیں تھا۔ ہم نے دس ہزار مرتبہ یہ باعثِ کوفت بات پڑھی تھی کہ نپولین آف ماریگو اور نپولین آف ماسکو میں کیا فرق ہے۔ لیکن اگر ہم واقعی ماریگو کی جانب دیکھ رہے ہوتے تو کبھی ماسکو کی آرزو نہ کرتے۔ ہم جانتے تھے کہ چارلس پنجم اپنے تخت و تاج سے مستعفی ہو گیا تھا۔ اور چارلس اوّل اپنے سر سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ رومن سلطنت زوال پذیر ہو گئی تھی اور یہ بھی کہ اسپینی سلطنت طوائف الملوکی کی زد میں آ گئی تھی لیکن اس گُر کو نہ تو کسی جرمن نے کبھی جرمن سلطنت پر اور نہ کسی برطانوی نے برطانوی سلطنت پر آزمایا تھا۔ لہٰذا اب ان سچائیوں کی بار بار کی تکرار مسلّمہ حقیقت کی پرانی اور غیر مختتم تکرار کی طرح ہی محسوس ہو گی۔ تاہم آج میرے لیے یہ ایک طرح سے حیران کُن اور چونکا دینے والی دریافتیں ہیں کیونکہ میں نے ضرب الامثال کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا ہے۔

یہ سب کچھ پچھلی عمر کے اُن بہت سارے تصوّرات کے مانند ہے جن کا اظ کی صورت میں ہر اس شخص کو بتانا تقریباً ناممکن ہے جو بذاتِ خود قسم کی صورتِ حال سے نہیں گزرا ہے۔ یہ تو بعد اور ہمواری کے اس کے مانند ہے جس کو تا دیر بیزاری سے دیکھتے ہوئے نوجوان آدمی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کو معاً پتہ چلتا ہے کہ جسے وہ ڈائیاگرام سمجھ رہا تھا وہ تو شیشت کا حامل ہے یہ تو غیر نامیاتی سے نامیاتی کی جانب ایک ناقابل بیان قسم کی تبدیلی ہے یوں جیسے کوئی قدیم مصری لوح پر کندہ پتھر کے افعی اور پرندے دوبارہ زندہ چیزوں کی طرح متحرک ہو گئے ہوں۔ جب ہم جوان تھے تو ضرب المثل مُردہ تھی مگر اب کہ ہم موت کے دروازہ پر دستک دے رہے ہیں تو یہ ایک جیتا جاگتا حکیمانہ قول بن گئی ہے۔ گویا جب ہم مر رہے ہوتے ہیں تو ساری دُنیا از سر نو زندہ ہو رہی ہوتی ہے۔

ایک اور تضاد یہ ہے کہ فقط نوجوان ہی نئی دُنیا کو پورے طور پر نہیں سمجھتے بلکہ جدید زمانے کے لوگ بھی جدیدیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کے سوا وہ اور کچھ بھی نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ وہ جب ایک متحرک پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہیں تو بھی یہ بمشکل جان پاتے ہیں کہ وہ حرکت کر رہا ہے یا نہیں! بعینہٖ جیسے ایک عام آدمی زمین کی معمول کی گردش کو محسوس نہیں کر پاتا، لیکن جسے وہ اس سے کافی شدت سے محسوس کرے گا جب زمین اپنی گردش اچانک اُلٹی طرف سے شروع کر دے گی۔ نسبتاً پرانی نسل ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھیں وہ وقت یقینی طور پر یاد ہے جب زمین ایک دوسرے انداز سے گردش کرتی تھی وہ واضح طور پر اور شدت سے اس عہد کو محسوس کرتے ہیں جو شروع ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کے آغاز سے قبل وہاں موجود تھے۔ بوڑھوں کی فن کارانہ خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نئی چیزوں کو ایک چمکتے ہوئے پس منظر میں دیکھ سکتے ہیں، یوں وہ واضح اور صاف نظر آتی ہیں۔ نوجوانوں کے لئے یہ تمام اشیاء بجائے خود ایک عقبی دیوار کا درجہ رکھتی ہیں اور بمشکل دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ ذہین ترین تخلیق کار بھی عموماً اپنی اختراع کی ماہیت کے بارے میں حیرت ناک حد تک غلط فہمی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کا شکار ہوتا ہے اور ان چیزوں کے بارے میں بھی جو واقعی نئی ہیں۔ سو جب ایک سب سے سال خوردہ باشندہ گاؤں کے مقرر کو اس بات کا اعلان کرتے ہوئے سنے گا کہ گاؤں کا گرجا گھر بہت جلد منہدم کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ ایک معدنیاتی فیکٹری قائم کر دی جائے گی تو وہ بالعموم ایک سٹھیائی ہنسی ہنس دے گا۔ اس لیے کہ سب سے جہاں دیدہ یہ باسی بخوبی جانتا ہے کہ اس کے بچپن کے زمانے میں کوئی گرجے میں نہیں جاتا تھا۔ ماسوائے امارت پرستانہ جذبہ رکھنے والے لوگوں کے اور اب خود اس کے بڑھاپے کے زمانے میں گرجا گھر ایک بار پھر سے معتقدوں کی آماج گاہ بن گیا ہے۔ اپنی اس حیثیت میں کہ میں سب سے پرانا باسی ہوں (بشمول ایک سٹھیائی ہنسی) میں صرف ایک طفلانہ قسم کی مثال کا اضافہ کرنا پسند کروں گا اور وہ یہ کہ آدمی کو کم از کم مجھ اتنا بوڑھا ضرور ہونا چاہیئے تاکہ اسے یاد آئے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کسی تعلیم یافتہ یا باشعور آدمی کا بھوت پریت میں یقین رکھنا احمقانہ، ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین متصور ہوتا تھا۔ آپ کو کم از کم سب سے پرانے باسی جتنا بوڑھا ضرور ہونا چاہیئے تاکہ آپ کو یاد آئے کہ کس ن اور نفرت کے ساتھ گاؤں کے مکھیا اور پادری نے گاؤں کے بھوت کی موجودگی امکان سے انکار کیا تھا۔ بالخصوص پادری نے مکھیا کے مقابلے میں کچھ زیادہ شدومد کا مظاہرہ کیا تھا۔ حالانکہ دیہات کے اس بھوت کو گاؤں کے شرابی روغ گو کی ہستی میں پلک جھپکنے میں ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ نتے تھے کہ مرے ہوئے دوبارہ اس جہانِ رنگ و بُو میں نہیں آتے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لیکن وہ جو پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہیں اور جنھوں نے سر ادیبور لاج ایسے سائنس کے مردِ میدان کو ایک مقبولِ عام مذہب کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے دیکھا ہے وہ جب کسی نوجوان کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ وہ: مافوق الفطرت عناصر سے نجات حاصل کر رہی ہے تو محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اس دنیا نے حقیقتاً کس سمت میں پیش قدمی کی ہے!

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جاپان کا بھوت

اس دُنیا میں ایسی چیزیں موجود ہیں کہ جن کے متعلق میں سنجیدگی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اُن سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں انھیں پسند نہیں کرتا۔ یہ بات محض الفاظی نہیں بلکہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے دُرست ہے۔ بلیاں وہ اوّلین ہستیاں ہیں جو میرے نزدیک اس اُصول کے سلسلے میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ بلیاں اتنی حسین ہوتی ہیں کہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ان کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ اتنی ناقابلِ فہم ہیں کہ وہ شاید انھیں تہ تیغ کر ڈالے میرے دوست احباب میں سے کچھ بلیوں کے بارے میں ایک انتہائی بلند اخلاقی رویّہ اپنائے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ مسٹر ٹنڑٹون کی طرح تو کو اس کی اخلاقی آزاد روی کی بنا پر (اور اس وجہ سے کہ وہ اچھا نہ کرنے والوں کے جسموں سے اپنا جسم رگڑنے پر سدا آمادہ رہتی ہے) مدکرتے ہیں۔ دیگر حضرات مسٹر بیلاک کی طرح بلی کو ظالم، پُراسرار اور دگرنیوں کی سہیلی قرار دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جو زہریلی غذا سوا ہر شے نگل جاتی ہے۔ گویا اس میں عیسائیت کی سادگی اور عجز کا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

قطعی فقدان ہوتا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں ایسے ہر قسم کے احساس سے عاری ہوں۔ میں بلیوں کی تعریف کرتا ہوں جیسے کہ میں CATKINS کی ستائش کرتا ہوں۔ وہ ننھی منی نرم ملائم روئیں دار چیزیں جو درختوں سے لٹکی ہوتی ہیں۔ وہ بیک وقت خوبصورت بھی ہوتی ہیں، فروالی بھی اور دونوں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعلان بھی کرتی ہیں اور تمام ذی روح چیزوں میں موجود یہ تجریدی رفعت سچ مچ محبت سے موسوم کی جا سکتی ہے۔ اس لیئے کہ یہ محض اُنس والی مناسبت سے ایک برتر احساس ہے۔ یہ تو ایک طرح کی رویت ہے۔ اس میں یہ مجاہدانہ بلکہ عارفانہ صفت ہے کہ یہ بدلے میں کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتی۔ میں گلی کوچوں کی ساری بلیوں سے اسی طرح محبت رکھتا ہوں جس طرح ایسی سی کا سینٹ فرانسس جنگل کے تمام پرندوں یا سمندر کی تمام مچھلیوں سے محبت کرتا تھا، بلاشبہ جملہ پرندوں اور مچھلیوں سے تو نہیں (مگر پھر یہ بھی سوچئے کہ میں کوئی عارفِ کامل تو ہوں نہیں) لیکن سینٹ فرانسس نے کسی پرندے کو اس طور لگام دے کر اور اس کی پیٹھ پر سواری کرنے کی خواہش کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا جیسے کوئی شخص گھوڑے پر کاٹھی ڈال کر اس پر سواری کرتا ہے۔ اس نے اس بات کی خواہش نہیں کی تھی کہ مچھلی کی گردن میں پٹہ ڈال دے جس پر "فرانسس" کا نام نامی اور پتا ASSISI رقم ہوا ہو، جیسا کہ کتوں کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس نے اس کی تمنا نہیں کی تھی کہ وہ مچھلیاں اس سے خود کو منسوب کر دیں یا وہ خود ان سے منسوب ہو جائے، درحقیقت یہ ایک انتہائی بے ڈھب تجربہ ہوتا اگر اتنی ڈھیر ساری مچھلیوں سے وہ منسوب ہو جاتا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لیکن دوسری طرف آدمی اپنے کتے سے واقعی منسوب ہوتا ہے۔ بالکل اس برابری کی سطح پر جس کے تحت کتا اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ فرماں برداری اور ذمہ داری کے عہد و پیمان کتوں اور آدمیوں کے معاملے میں بدل تو جاتے ہیں۔ لیکن وہ یقیناً پیمان ہی رہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک شخص فقط ایک کتے سے اس طور محبت نہیں کرتا جیسے (ایک روحانی لمحۂ خود فراموشی میں) کسی چڑیا سے جو اس کی کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ کر چہچہاتی ہے یا کسی خرگوش سے جو زقندیں بھرتا ہوا اس کا راستہ کاٹ جاتا ہے آدمی کتے کو چاہتا ہے اور یہ ایک خاصی سنجیدہ بات ہے!

میرے نزدیک بدقسمتی سے (میں صرف ذاتی پسند کا ذکر کر رہا ہوں) بلی ایک جنگلی جانور ہے۔ بلی فطرت کی تجسیمی صورت ہے۔ فطرت کے مانند یہ اتنی پراسرار ہے کہ اس کی سُپردگی میں بھی انسان کو شکم چین نصیب نہیں ہے۔ لیکن فطرت ہی کی طرح یہ اتنی دلکش ہے کہ کوئی اس بات کو مان نہیں سکتا کہ یہ واقعتاً سفاک بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ایسی نہ ہو اور اس معاملے میں بھی یہ فطرت سے مشابہ ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ بلیوں کی ویسی ہی پرستش کرتے تھے جیسی کہ مگرمچھوں کی، اور وہ عظیم المرتبت بوڑھے عارف اس بات سے باخبر تھے کہ وہ کن کی پوجا کر رہے تھے۔ وہ لمحہ جس میں کوئی سچ مچ بلیوں سے محبت کرتا ہے اس لمحے ہی کے مانند ہے جس میں کوئی (اعتدال اور شعور کی حد میں رہتے ہوئے) مگرمچھوں سے پرہیز کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نرفت کا لمحہ ہے جب انسان اپنے تئیں محسوس کرتا ہے ـــــ نہیں، تمام اشیاء ایکتا میں جذب ہو کر نہیں (کہ یہ ایک مکروہ گمان ہے) بلکہ تمام اشیاء کے باہمی امتیازات لطف اندوز ہوتے ہوئے جس لمحے کوئی فی الواقعہ یہ جان جاتا ہے کہ وہ آدمی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہے تو وہ اس بات میں ایک طرح کا طمانیتی لطف محسوس کرے گا کہ مگرمچھ ، مگرمچھ ہی ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں پر زیادہ اترائے گا جو بظاہر مگرمچھوں کی نسبت نمایاں طور پر خوبصورت ہیں جیسے مثلاً پھول، پرندے اور خاص طور پر تتلیاں ——— جو ان باقی دو کے مقابلے میں زیادہ حسین ہوتی ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ تمام پھولوں کو توڑنے اور سارے پرندوں کو پنجرے میں بند کرنے یا تمام تتلیوں کو حاصل کرنے کی خواہش بھی کرے گا۔

ایسا کوئی نہیں ہے جو جمہوریت اور حقوق انسانی پر ایمان ہو اور جو اس بات کو تسلیم کرے کہ آدمی اور آدمی کا باہمی فرق آدمی اور چوپائے کے مابہ الامتیاز سے مشابہ ہے۔ مگر ایسی قیاس سازی مماثلت کے دائرہ کار میں بہرحال ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہیں میں اس ضمن میں تتلیوں کا جزو محسوس کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ انھیں چاہنے بغیر میں ان سے محبت کر سکتا ہوں۔ میں متعدد عجیب و غریب اور اجنبی معاشروں یا خصوصاً جاپانیوں کے سلسلے میں یہی بات محسوس کرتا ہوں۔ قدیم جاپانیوں کی نفیس نقش نویسی (جس کو ہم اب دیکھ نہیں پائیں گے۔ کیونکہ جاپان ترقی اور استعماریت کی طرف قدم بڑھا چکا ہے) میں ایک ایسا وصف تھا جو بے اندازہ پرکشش اور غیر ارضی نوعیت کا تھا۔ جاپانیوں کی تصاویر فی الاصل ایسی تھیں کہ محسوس ہوتا تھا گویا وہ تتلیوں نے انھیں تخلیق کیا ہے۔ وہ پروں ایسی ملائمت اور بے ساختہ قسم کی چست خراشوں سے بھری نرمی دکھائی دیتی تھیں۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی گیلری میں ادھر ادھر گھومے جو خوش قسمتی سے اپنے اندر چاول سے بنے کاغذ پر (جو کہ مشرق کے دور دراز علاقوں سے آتا ہے)

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہلکے آبی رنگ سے بنے خاکوں کے عمدہ نمونے رکھتی ہو تو وہ اُن میں لاتعداد ایسے اجزا کا مشاہدہ کرے گا، جنھیں خیالی دُنیا میں رہنے والا شخص تتلیوں جیسا شمار کرتا ہے مثال کے طور پر درختوں کی ان ٹہنگوں سے ایک انوکھا لطف کشید کرنا جن تک یقیناً کوئی مصور نہیں، صرف تتلیاں ہی پہنچ سکتی ہیں۔ جہاں پر چودھویں کے چاند کا بجھتے ایسا پیلا اس قدر نمایاں اور روشن ہوتا ہے کہ لگتا ہے جیسے چینیوں کی لالٹین ان پتلی شاخوں سے لٹکی ہوئی ہو۔ وہ چاند اس قدر بڑا اور منور دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی یہ تصور کر سکتا کہ ایک سو تتلیاں اس کے نیچے کھڑی دوڑ رہی ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں پرندوں اور مچھلیوں کے ڈھانچوں کو تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے جو ایسے موضوعات ہیں جن میں تتلیاں خاصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہاں مجلہ مشرقی دیوتاؤں اور آدمیوں کی بلّی ایسی ترچھی آنکھ ہوتی ہے ——— لیکن یہ تو مشابہت کو ضرورت سے زیادہ نشان زد کرنے کی بات ہے۔ ایسی صورت میں تو ہم بہت جلد ایک نئے نسلی نظریہ کو اپنا لیں گے (جس کا آغاز کچھ یوں ہوگا) کیا تمام جاپانی لوگ تتلیاں ہیں؟" اور ہر چند کہ میں اپنے اس نظریہ پر ایمان نہیں لاؤں گا، تاہم دوسرا کوئی بھی شخص اس پر ایمان لا سکتا ہے۔ مجھ سے خط و کتابت کرنے والے معتبر اور قابلِ تکریم حضرات میں ایسے لوگ شامل ہیں جو کسی بھی چیز پر ایمان لا سکتے ہیں۔ یہاں میرے لئے فقط یہ کہہ دینا کافی ہے کہ محدود حوالے سے جاپانی لوگ مجھے تتلیوں ہی کی طرح معتبر کرتے ہیں۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان کی قدیم وضع کی ملکی شاعری کو، ان کی سیدھی سادی تہذیب کی جبلت کو، ان کے مثالی فن کو جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے اور ان کی انسان اور فطرت کے ضمن

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میں انتھک دوڑ دھوپ پر مبنی مصروفیات کو پسند کرتا ہوں۔ اگر میں واقعی ایک صوفی ہوتا جو سچ مچ کی ایک پہاڑی پر سے اُن پر نگاہ ڈال رہا تھا تو مجھے کامل یقین ہے کہ میں ان سے توانا پروں والے، اَن تھک پرندوں یا تیزی سے اپنی نسل کو بڑھانے والی زرخیز صفت مچھلیوں کے مقابلے میں زیادہ پیار کرتا۔ لیکن جہاں تک انھیں پسند کرنے کا معاملہ ہے جیسے کوئی ایک کتے کو چاہتا ہے ——— تو وہ ایک بالکل دوسرا مسئلہ ہے۔ اِس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میرا اُن پر اعتماد بھی ہے۔ (حالانکہ نہیں ہے)۔

انگریزی اور سکاچ کی چار بیتی رزمیہ نظموں میں پریوں کا اسی طریقے سے اقرار کیا گیا ہے جس طرح کہ میں جاپانیوں اور تلیوں کا اقرار کرنے کی طرف مائل ہوں۔ انھیں بطورِ خاص شمر نہیں کہا گیا ہے۔ ان سے تو اس بنا پر لطف اندوز ہوا گیا ہے کہ وہ سحر انگیز اور حیرت ناک ہیں۔ لیکن ان پر بطورِ خیر اعتماد نہیں کیا گیا ہے۔ آپ ان کے بارے میں غلط سلط نہیں کہتے۔ نہ انھیں غلط قسم کے تحائف ہی پیش کرتے ہیں اور اس بارے میں تو پُر تجسس خاموشی مسلط ہے کہ اگر آپ ایسا کر گزرتے تو آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اب جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے جاپان بالخصوص فنون کا جاپان ہمیشہ سے ایک پرستان دکھائی دیا ہے۔ آہ، وہاں کے درخت تو پھولوں کی طرح خوش باش ہیں۔ اور پہاڑی چوٹیاں ایسی ہی سفید براق ہیں جیسے شادی بیاہ کے کیک۔ لالٹینیں اتنی بڑی ہیں جتنے کہ مکانات اور مکانات اتنے ہی نازک ہیں جتنی کہ لالٹینیں! ..... لیکن ..... ایک عیسائی مشنری نے بیان کیا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

(میں نے اخبار میں پڑھا ہے) کہ جاپانیوں کی اذیت رسانی کا اقرار یا انکار
محض لفظی ترجمہ کا مسئلہ تھا کیونکہ اہلِ جاپان انگوٹھے کو اُلٹی طرف موڑنے
کو اذیت نہیں گردانتے۔"

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جے۔ بی۔ پریسٹلے

بے کار رہنا

میں اپنے ایک دوست کے ساتھ جو ایک فن کار ہونے کے علاوہ خوش باش قسم کا ایک کابل شخص بھی ہے اس کے چوبی مکان میں قیام پذیر تھا جو ریلوے اسٹیشن سے کوئی دس کوس دُور یورک شائر کے نشیب کے عین درمیان واقع ہے۔ اب اسے ہماری خوش قسمتی کہئے کہ ہمارا سابقہ یکایک واقعی گرم موسم کی ایک لہر سے آن پڑا۔ ہم ہر نئی صبح کو روانہ ہوتے اور قریب ترین بہیڑ[1] والا راستہ پکڑ کر آرام سے اوپر چڑھتے جاتے حتّٰی کہ سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتے اور پھر طویل سنہری دوپہریں زمین پر چت لیٹ کر گزار دیتے۔ بغیر کوئی کام کئے۔ بہیڑ سے بہتر کوئی دوسری آرام دہ جگہ نہیں ہے۔ یہ ایک نوع کے بہشت سے متصل ایک صاف ستھرا، خالی سا مختصر ایوان ہے جس کے زیرِ سایہ نمایاں طور پر دکھائی دینے والی یکسانیت فوری طور پر کوئی ہیجان پیدا نہیں کرتی۔ جہاں رنگ و صوت کا مسحور کن ڈراما کھیلا نہیں جاتا، جس میں آہستہ آہستہ زاویے بدلنے والے ابر پاروں اور سایوں اور ہلکے رنگ و روپ والے افق پر ایک ایسا لطیف سا تنوع موجود رہتا ہے جو دن بھر

[1] بہیڑ MOOR LAND

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ذہن میں دلچسپی کی لو کو قائم رکھنے کے لیئے کافی وشافی ہے۔ بیہڑ کا عمدہ گھاس کا مخملی غرفہ جو ایک ڈرائنگ روم کے قالین سے بڑا نہیں ہے اور جس کی سطح سکون مہیا کرنے کی صلاحیت عام دیتی ہے۔ اس کا الگ تھلگ انداز، اس کا دوام، آدمی اور اس کے تفکرات سے بے اعتنائی برتنے والا اس کا کہنہ چلن، ذہن کو تسکین اور پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ جہاں دنیا بھر کی آوازیں گگڑمی (کراکل) کی فقط ایک یکسانیت سے لبریز چیخ میں غرق ہو جاتی ہیں۔ 10750

یوں ہر روز ہم خود کو بیہڑ کی سطح پر کھل کر لیٹے ہوئے، آسمان کی جانب یا دور افق پر خوابناک نظریں گاڑے ہوئے دیکھتے رہتے۔ تاہم یہ بات کہنا پوری طرح درست نہیں ہے کہ ہم قطعی طور پر کچھ نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ ہم نے کافی زیادہ وقت نوشی کی، سینڈوچ اور چاکلیٹ سے بنی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں چبائیں، ٹھنڈی ٹھار جھاگ اڑاتی ان ندیوں سے پیاس بجھائی جو نجانے کہاں سے پھوٹ پڑتی ہیں، چند سو گز تک گھڑکتی چلی جاتی ہیں اور پھر دوبارہ غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھار ہم آپس میں ایک یا دو جملوں کا تبادلہ بھی کر لیتے۔ لیکن ہم غالباً کچھ نہ کرنے کی حالت کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ جس سے آگے جانا ہماری نسل کے افراد کے لئے ممکن نہیں ہے۔ ہم کچھ نہیں بناتے تھے، حتیٰ کہ منصوبے بھی نہیں۔ کوئی اکیلا خیال تک ہمارے دماغوں میں داخل نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ ہم خوش طبع قسم کی وہ شیخی بھی نہیں بگھارتے تھے جو عموماً دڑبہ نما مراسم رکھنے والے مردوں کی وقت گزاری کا حصہ ہوتی ہے۔ ہم

CURLEW

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے بہت دور ہمارے دوست احباب اور رشتہ دار روزمرہ کے معاملات میں
اُلجھے ہوئے تھے اور دوڑ دھوپ میں مصروف تھے، منصوبہ بندی میں جُتے ہوئے
تھے، نیز جھگڑوں میں اُلجھے، جمع تفریق کے عمل میں کھوئے ہوئے تھے، لیکن ہم دیوتاؤں کی
طرح تھے جو کچھ نہ کرنے میں پوری طرح مصروف تھے۔ ہمارے دماغ بے داغ خالی
جگہوں کی طرح تھے لیکن جب ہمارا بے فکری کا یہ مختصر زمانہ ختم ہوگیا اور ہم آخری
مرتبہ چہروں پر اتنی سُرخی سمیٹے ہوئے اترے جتنی غروبِ آفتاب کے وقت
ہوتی ہے تو گویا ہم دُنیاداروں اور اخبار کے مالکوں کے جہان میں اتر آئے۔
محض یہ جاننے کے لیے کہ ہم مسٹر گارڈن سلفرج کے ہاتھوں ابھی ابھی کُتکُ کھلا قابلِ
مذمت گردانے گئے ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ کب اور کہاں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ کن خوش دل
لوگوں نے اسے مدعو کر کے اس کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ اس موسم میں جب نامانوس
سورج ہماری کجرویوں کو پختہ کر دیتا ہے تو عجیب و غریب چیزیں وقوع پذیر ہونے
لگتی ہیں۔ یہ گزشتہ برس یا اس سے سال پہلے کا قصہ ہے کہ کسی مہم جو شخص
نے تیرِ اعظم یورپ کا باقاعدہ دورۂ سیاحت ترتیب دیا تھا، اور زیادہ مفکرانہ
طرز سے تعطیلات منانے والوں کو ترغیب دلانے کے لیے یہ کہا تھا کہ سیر و
سیاحت کے دوران مختلف مقامات پر معروف مصنفوں سے درسِ زبانی کے
سلسلہ کا انتظام و انصرام بھی ہوگا۔ چنانچہ خوش و خُرم سیر و سیاحت کے
رسیا سیاح عازمِ سفر ہو گئے۔ اُن کا رہبر مشاہدے کے باب میں اتنا ہی اچھا
تھا جتنے کہ اس کے بول تھے۔ مثلاً پہلے ہی مقامِ قیام پر ڈین اینگ نے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

انھیں جدید شوقِ لطف اندوزی کے موضوع پر خطبہ دیا، لیکن مسٹر سلفرج چاہے وہ چھٹیاں گزارنے والوں کے مجمع سے یا ایمپوریم کے مالکان کی کسی سنجیدہ تقریب سے خطاب فرما رہے ہوں، اتنا مجھے پتہ ہے کہ وہ یہ ضرور فرمائیں گے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ کاہلی سے نفرت کرتے ہیں اور اسے گناہِ عظیم گردانتے ہیں مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ انھوں نے ان حضرات کے بارے میں بھی اپنے فیصلوں کا اظہار کیا ہوگا جو تضیعِ اوقات کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن میں ان کے امثال اور دلائل کو بھلا بیٹھا ہوں اور تکلف برطرف ان کو دوبارہ یاد کرنا کہ وہ کیا کچھ تھے میرے خیال میں تضیعِ اوقات کا ایک شرم ناک عمل ہے۔ مسٹر سلفرج نے نام لے کر ہمارا ذکر اذکار تو نہیں کیا، لیکن اس بات پر شک و شبہ کرنا تقریباً محال ہے کہ کاہلی پہ حملہ زن ہونے کے دوران ہمہ وقت ہم ہی ان کے پیشِ نظر رہے تھے۔ شاید اُن کے ذہن میں ہم دونوں دوستوں کی تصویر تھی کہ ہم بیہڑ میں سبزے پر چت لیٹے ہوئے ہیں اور شاہانہ طریق سے وقت ضائع کر رہے ہیں، جب کہ تمام امورِ دُنیا پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے لیے سراپا انتظار ہیں اور جنھیں سوئے اتفاق سے بعد ازاں مسٹر سلفرج کے سٹور سے خریدا اور فروخت کیا جانا بھی ہے۔ میرا خیال ہے یہ تصویر اُسے اچھی لگتی ہوگی۔ ہم تو ہمہ وقت نظروں کو آسودگی پہنچانے والا منظر تھے۔ لیکن جب ہم بے کار بیٹھے ہوں تو یہ منظر چاہے کتنا ہی نامکمل اور چکرا دینے والا کیوں نہ ہو ہر کسی کو دیکھنے میں ضرور بھلا لگے گا۔ خوش قسمت سے مسٹر سلفرج نے کاہلی کے گناہ کے بارے میں ایک رائے قائم کر لی ہوئی تھی۔ سو وہ اطمینانِ کلی پر آمادہ نہ تھے اور نہ ہی محظوظ ہونے کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لئے تیار تھے۔ یہ حالت کاہلی والے جملے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اُن کے خیالات غلط، و یقینی طور پر مضرت رساں محسوس ہوتے ہیں۔

اِس دُنیا کا سارا شر اُن لوگوں کا پیدا کردہ ہے جو سدا جاگتے اور کام میں مصروف رہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ انھیں کب جاگنا چاہئے اور نہ ہی یہ پتہ ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک ابلیس ہنوز کائنات کی مصروف ترین ہستی ہے اور میں اسے کاہلی کو موردِ الزام ٹھہراتے اور وقت کے ادنیٰ ترین ضیاع پر سیخ پا ہوتے ہوئے بہ آسانی دیکھ سکتا ہوں۔ اس کی سلطنت کے بارے میں میں شرط بدھ کر کہوں گا کہ اس میں کسی کو فارغ رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ فقط ایک سہ پہر کے لئے بھی نہیں۔ دُنیا کے بارے میں ہم بہ آسانی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کیچڑ میں لت پت ہے، لیکن میں وہ واحد ہستی ہوں جس کے نزدیک اس صورتِ حال کے لئے کاہلی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ فعال نیکیاں نہیں بلکہ منفعل نیکیاں ہیں جن کا کاہلی میں فقدان ہوتا ہے۔ ہمدردی اور تھوڑی سی راست سوچ کے سوا یہ کچھ بھی کر گزرنے پر قادر ہیں۔ دُنیا میں ابھی کافی مقدار میں شکتی موجود ہے ــــ (پہلے کبھی بات کا بتنگڑ بنانے والوں کی اتنی فراوانی نہ تھی۔) لیکن اس کا زیادہ تر استعمال غلط نہج پر ہو رہا ہے۔ اگر مثال کے طور پر جولائی ۱۹۱۴ء میں جو ایک طرح کا مہا کاہلی والا دور تھا۔ حکمرانوں، بادشاہوں، نوابوں، سیاست دانوں، جرنیلوں اور صحافیوں میں سے ہر کوئی بے کار رہنے کی شدید خواہش میں مبتلا ہو جاتا۔ (محض سورج کی ضو میں گھومنے پھرنے اور تمباکو نوشی کی خاطر) تو ایسی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

صورت میں شاید ہم سب کا حال موجودہ حالت کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتا۔
لیکن نہیں، پُر مشقت زندگی پر مبنی نظریہ ہنوز مبارزت طلبی کے بغیر جاری ہے کہ کہیں
وقت کا ضیاع نہ ہونے پائے۔ کچھ تو لازماً ہوتا رہنا چاہئے اور جیسا کہ ہم آگاہ
ہیں کچھ نہ کچھ تو بہرحال ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ فرض کیجئے کہ ہمارے سیاست
دان ورسیلز کی امن کانفرنس میں شرکت کے لئے اپنے ناپختہ خیالات کے پشتارے
باندھ کر اٹھ بھاگتے اور یوں توانائی کی وافر مقدار ضائع کرنے کے بجائے اگر دو ہفتوں
کے لئے تمام مراسلت بازی نیز انٹرویو بازی اور ساری چخ پخ سے دست کش ہو کر
فقط کسی دامن کوہ یا کسی ایسی ہی پُر سکون جگہ پر آرام سے ٹہلتے اور بادی النظر میں اپنی
ہنگامہ خیز زندگیوں میں پہلی بار کہیں بیٹھ کر کچھ نہ کرنے کے مرتکب ہوتے تو ایسی صورت
میں وہ نام نہاد امن کانفرنس میں شرکت کے باوصف اپنی شہرت کو داغدار کئے
بغیر دُنیا کے کاموں کو سنوار کر واپس آ سکتے تھے۔ آج بھی اگر یورپ میں آدھے
سیاست دان اِس نظریہ کو ترک کر دیں کہ کاہلی ایک جُرم ہے اور کہیں جا کر کچھ
مدت کے لئے کچھ نہ کریں تو ہمیں یقیناً اس سے فائدہ ہی پہنچے گا، کچھ اور
مثالیں بھی ذہن میں آ رہی ہیں۔ مثلاً آئے دن مخصوص مذہبی فرقوں کے لوگ
(اصلاحِ احوال کے لئے) اپنے اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ لیکن پہاڑوں جتنی
برابر موجود ہیں اور گو تہذیب کا انجام معلوم ہے۔ پھر بھی یہ لوگ جو
وں میں شرکت فرماتے ہیں اپنا بیشتر وقت خواتین کے سکرٹ کے
ے اور ناچ کے طنبوروں کی کل کل کی مدحت میں صرف کرتے ہیں۔ ان کے
بجا ہوتا کہ وہ کہیں چت لیٹ جاتے آسمان کو ایک تار دیکھتے اور یوں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ذہنی طور پر صحت یاب ہو جاتے۔

امریکہ میں کاہلی مہا پاپ ہے"۔ اور اس سے منسلک پُر مشقت زندگی کا عقیدہ بہت مروج ہے۔ ویسے ہم اس حقیقت کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے کہ امریکہ جیران کُن طور پر ایک خوش حال ملک ہے لیکن اس کے علی الرغم ہم اس سچائی سے روگردانی بھی نہیں کر سکتے کہ وہاں کا معاشرہ اس حال میں ہے کہ اس کے تمام اچھے ہم عصر لکھاری طنز سے کام لینے لگے ہیں۔ یہ کافی عجیب بات ہے کہ امریکہ کے اکثر بڑے قلم کاروں نے کاہلی کو سراہنے میں تامل سے کام نہیں لیا ہے اور بالعموم ان کی کچھ نہ کرنے کی صلاحیت اور اپنے اس وصف کی تعریف کرنے کا عمل ہی ان کی نجات کا باعث ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ اگر تھوریو THOREAU کاہل رہنے اور سوائے کہکشاں کی ستائش کرنے کے کچھ نہ کرنے کی سکت سے محروم ہوتا تو محض خود پسند شخص ہوتا اور وہ مین اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اِدھر اُدھر مسٹر گشتی کرنے کی عادت اور اپنے ایامِ رفتہ کی اس معصوم شادمانی کو تج دیتا تو وہ محض ایک بڑی جسامت کا گدھا بن کر رہ جاتا۔ فورتو کوئی بھی احمق بچا سکتا ہے اور اپنی فاضل قوت سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن آدمی کے اپنے من میں کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیئے' اس سے قبل کہ وہ بے کار رہنے کا لائحہ عمل مرتب کر سکے' اس کے پاس لازماً آئندہ کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کو ہونا چاہیئے۔ ضروری ہے کہ وہ اس قابل ہو کہ خوابوں اور خیالوں کے آہستہ خرام دریاؤں میں کود سکے۔ لازم ہے کہ وہ اندر سے ایک شاعر بھی ہو۔ ورڈزورتھ کہ جس کی طرف ہم اس وقت رجوع کرتے ہیں جب اکثر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دوسرے شعرا ہمیں مایوس کر دیتے ہیں، بے کار رہنے کی قدر و منزلت سے آگاہ تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس سے بہتر اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ آپ اُس کے کلام میں اس میلان کی بہترین صورت تلاش کر سکتے ہیں۔ وہ طویل عمر زندہ رہا تاکہ اپنی جوانی کی بیشتر آرا سے دست کش ہو سکے۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ کبھی اپنی جوانی کے اُس تصور کی ٹوہ میں گیا ہو کہ آدمی کے پاس کاہلی سے گھومنے اور فطرت کا نظارہ کرنے سے بڑھ کر کوئی اور صحت مند اور رفعت آفرینا مصروفیت نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ وہ اپنی ایک نظم میں کچھ خانہ بدوشوں پر برہم ہوا کیونکہ اُس وقت سے لے کر جب وہ پہلی بار اُن کے پاس سے گزرا تھا۔ بارہ گھنٹے بیتنے کے بعد تک جب اس کا گزر وہاں سے دوبارہ ہوا تو بظاہر انھوں نے تقریباً کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ یہ ایک نسلی عصبیت ہے جس میں حسد کے رنگ کی آمیزش موجود ہے کیونکہ ہر چند خود اُس نے بھی اِس عرصہ میں کچھ زیادہ کام نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ لوگ اُس سے بھی کم کام کے مرتکب ہوئے تھے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو مجھے اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے نظریات کے پرچار میں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ولولے اور تواتر سے کام لیتا۔ اِس بات کا امکان بھی ہے کہ وہ مسٹر سلطرج پر چڑھ دوڑتا اور ہمارا دفاع اپنے ان متعدد مانیفیسٹوں میں کرتا (جو اس مصرع سے شروع ہوتے کہ پچھلے ہفتے وہ ایک یخ اور ویران بیہڑ میں گھومتے رہے تھے۔) لیکن جنہیں شمہ بھر توجہ حاصل نہ ہوتی۔ وہ ہمیں آگاہ کرتا کہ ساری دنیا کی حالت بہتر ہو جاتے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اگر دنیا والے آئندہ دس برس میں ممکنہ حد تک اپنا ہر وہ لمحہ جو انہیں
نصیب ہو سکتا ہو۔ بیمار میں چت لیٹ کر اور بے بسی کی حالت
میں گزار دیں اور یہ بات کہنے میں وہ یقیناً حق بجانب ہوتا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

منتخب تفاخرات

تمام بنی نوع انسان کسی نہ کسی چیز کے بارے میں تفاخر پسندی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس میں یہ گرہ لگانے کو جی چاہتا ہے کہ ایسی کسی چیز کا وجود نہیں ہے جس کے سلسلے میں بندگانِ خدا تفاخر محسوس نہ کرتے ہوں۔ تاہم یہ بلاشبہ ایک مبالغہ آمیز بات ہوگی۔ ایسی کئی ایک جسم کو بد وضع کرنے والی مہلک بیماریاں موجود ہیں جن کے بارے میں غالباً کبھی تفاخر پسندی کا اظہار نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کہیں جذام پر فخر کرنے والے بھی موجود ہوں گے۔ زیادہ نمایاں بیماریاں، جب کہ وہ خطرناک بھی ہوں اور نسبتاً کم موذی بیماریاں خاص طور پر جب وہ امراکی بیماریاں ہوں — ایسی بیماریاں بالعموم خود نمائی پر مبنی تفاخر پسندی کا منبع ہوتی ہیں۔ گھلا دینے والی تپ دق میں مبتلا احساسِ برتری رکھنے والے متعدد بالغ نوجوانوں سے میں مل چکا ہوں جو اس بات کو رومان انگیز مانتے تھے کہ گُل جوانی کے کھلنے کے عالم ہی میں وہ کیٹس یا میری باش کرسف کی طرح مُرجھا جائیں۔ صدحیف دق کے ہاتھوں مرنے والوں کے آخری ایام عموماً بڑی حد تک ان تفاخر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پسند سادہ لوح نوجوانوں کے اندر کے لئے کا رومان آمیز ہوتے ہیں۔ وہ جوان آخری مراحل کو واقعی دیکھ چکا ہو۔ اسے ان نوجوانوں کی خوش دل سخن گسترانہ باتیں اتنی ہی غصہ دلانے والی نظر آتی ہیں جتنی کہ وہ قابل رحم ہیں۔ بیماری پر فخر کرنے والے ان عامیوں کے معاملے میں جن کے امتیاز کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ رؤسا کو لاحق ہونے والے عارضوں میں سے کسی ایک عارضے میں مبتلا ہیں، ہمدردی، برہمی کو کم نہیں کرتی۔ وہ جو کافی فراغت، کافی مال وزر کے مالک ہیں اور جن کی صحت بھی کافی اچھی ہوتی ہے —— ایسے لوگوں کا ایک صحت افزا مقام سے دوسرے کی طرف مائل بہ سفر رہنا، فرضی بیماریوں کا علاج ڈھونڈنے کی خاطر ایک معالج سے دوسرے مقبول معالج کی طرف جانا، یہ سب ہم سے توقع نہیں رکھ سکتا کہ ہم اس معاملے میں ان سے فراواں ہمدردی کا مظاہرہ کریں گے۔ (ایسی بیماریاں جو اگر وجود بھی رکھتی ہیں تو ان کا باعث غالباً بسیار خوری ہے)

علالت والی تفاخر پسندی ان لاتعداد تفاخرات میں سے ایک ہے جسے قابل احترام قرار دینے میں کوئی نہ کوئی اپنی شان محسوس کرتا ہے۔ وجہ یہ کہ تفاخرات کے اپنے مدوجزر رہتے ہیں۔ ان کی سلطنت انتہائی مصدقہ تاریخی انداز سے بام عروج پر جاتی ہے۔ پھر زوال آمادہ ہوتی ہے اور بالآخر انحطاط پذیر ہو جاتی ہے۔ سو سال قبل جس نوع کے تفاخرات اچھے سمجھے جاتے تھے آج ان کا رواج باقی نہیں رہا۔ چنانچہ خاندانی تفاخرات ہر جگہ رو بہ زوال ہیں۔ ثقافت والی تفاخر پسندی کو جو آج بھی توانا ہے، اب جہالت اور حماقت کی اس تفاخر پسندی کی مدد سے جو میرے خیال میں پوری تاریخ میں بے مثال ہے، ایک منظم

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور فعال لیکن کم آن بان والی تحریک سے پنجہ آزمائی کرنا پڑ رہی ہے۔ امریکی موافقات سے جنم لینے والی بدمست تفاخر پسندی بھی ہمارے زمانے کا کوئی کم امتیازی نشان نہیں ہے۔ اس تفاخر پسندی کے مردانگی سے عاری اثرات ساری دنیا میں نہایت سرعت سے پھیل رہے ہیں۔ حتیٰ کہ فرانس میں بھی جہاں لذیذ درخت رز کی بے شمار اقسام مدتہا نہ قوتِ تمیز کا اطلاق کر چکی ہیں اور محض پینے پلانے کے عمل کو حیوانی قرار دے چکی ہیں اور جہاں امریکی شراب خوری کی تفاخر پسندی اپنے نفرت انگیز لوازمات یعنی ایک سے تُند کے ذائقے کی صورت عمومی طور پر اور کاک ٹیل کی صورت میں خصوصی طور پر اُمرا میں مقبول ہو رہی ہے۔ مست مال جذبۂ تفاخر پسندی نے سلجھے ہوئے مردوں اور تربیت یافتہ ہر عمر (یعنی پندرہ سے ستر برس تک) کی خواتین کو اب معاشرتی سطح پر اس بات کی اجازت دی ہے (اور بعض حلقوں میں اسے قابلِ احترام بھی قرار دے دیا ہے) کہ وہ پبلک میں نہ سہی کم از کم نجی محفلوں میں کھلم کھلا شراب خوری کرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

جدیدیت کی تفاخر پسندی ہر چند کہ ہمارے عہد سے مخصوص نہیں ہے اب ایک بے مثال اہمیت کی حامل متصور کی جانے لگی ہے۔ اس کے اسباب آسان نہائی معاشی نوعیت کے ہیں۔ جدید مشینری کی مہربانی سے رسد طلب سے رہی ہے۔ صارفین کے ہاں اجتماعی طور پر تلف کرنے کا رجحان ہماری صنعتی حالی کی پہلی شرط ہے۔ جس قدر جلد ایک صارف اس چیز کو جو اس نے خریدی پھینک دیتا ہے اور دوسری خریدتا ہے آجر کے حق میں بہتر ہے۔ یقیناً ایک

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہی وقت میں آجر کے لئے فقط یہ کام کرنا لازم ہے کہ وہ انتہائی جلدی ٹوٹ پھوٹ جانے والی اشیاء کے علاوہ کچھ پیدا نہ کرے۔ وہ آدمی جو ایسا سلائی سیکپر تعمیر کرے جو چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہے، عمارت سازی کے کاروبار میں غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ الفاظ امریکہ کے ایک عظیم عمارت ساز کے ہیں۔ موٹر گاڑی، جوتا، کپڑوں کا جوڑا وغیرہ جو ایک سال تین ماہ یا چھ ماہ چلتے ہیں۔ اگر یہ بھی سلائی سیکپر کی طرح چالیس سال تک چلیں تو آپ کو جدید صنعت کے کسی بھی رہنما کے الہامی فرمودات کی خبر ہو جائے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ جدیدیت پر فخر کرنے والا اس صنعت کار کا بہترین دوست ہے۔ جدیدیت کی تفاخر پسندی رکھنے والے فطرتاً اپنے پرانے تصرفات کو پرے پھینک دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً اونچی شرح پر نئی اشیاء خریدتے ہیں جو جدیدیت کی تفاخر پسندی میں اسیر نہیں ہیں۔ لہٰذا آجر کا فائدہ اس بات میں ہے کہ وہ جدیدیت کی حامل تفاخر پسندی کی حوصلہ افزائی کرے جس کا درحقیقت وہ خود بھی مظاہرہ کرتا ہے اور یہ مظاہرہ ایک بہت بڑے پیمانے پر اشتہار بازی کی صورت میں لاکھوں پاؤنڈ کے اصراف سے ہوتا ہے۔ اخبارات ان لوگوں کی خوب معاونت کرتے ہیں جو بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یوں اشتہار بازی کے سیلاب میں بالواسطہ انداز میں کم خرچ کا حامل وہ پراپوگنڈہ شامل ہو جاتا ہے جو تفاخر پسندی کی معاونت کرتا ہے۔ عوام الناس کو یہ رٹایا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ مطابقت، انسان کے اہم وظائف میں سے ہے۔ عاجز انسان، اس بار بار دہرائی گئی تجویز کو قبول کر لیتا ہے۔ لیجئے اب ہم سب کے سب جدیدیت کا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تفاخر پسندی رکھنے والے بن گئے!

ہم میں سے بیشتر مصوّری کی تفاخر پسندی میں مبتلا ہیں۔ فنِ مصوّری کی تفاخر پسندی کی دو قسمیں ہیں ـــــ افلاطونی اور غیر افلاطونی۔ افلاطونی طرز والے، آرٹ میں محض دلچسپی لیتے ہیں۔ غیر افلاطونی آرٹ والے تفاخر پسند اس سے آگے جاتے ہیں اور واقعتاً فن کو خریدتے ہیں۔ افلاطونی آرٹ سے متعلق تفاخر پسندی ثقافت سے متعلق تفاخر پسندی کی ایک شاخ ہے۔ غیر افلاطونی تفاخر پسندی خچر کی طرح دوغلی ہے۔ اسی لئے یہ بیک وقت کلچر والی تفاخر پسندی اور ملکیت والی تفاخر پسندی کی ذیلی قسم ہے۔ آرٹ کے فن پاروں کا ایک ذخیرہ، تمدنی علامات کا ایک مجموعہ ہے اور تمدنی علامتیں بنوزر سماجی وقار کی حامل ہیں۔ یہ دولت کی علامتوں کا بھی ایک مجموعہ ہے کیونکہ کاروں کے ایک پورے بیڑے کے مقابلے میں فن پاروں کا ذخیرہ زیادہ مؤثر سرمایہ کاری کی نمایندگی کرتا ہے۔

بقیدِ حیات فن کاروں کے نزدیک آرٹ والی تفاخر پسندی کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہے۔ بے شک زیادہ تر آرٹ والے تفاخر پسند صرف مرحومین کے فن پاروں کو ذخیرہ کرتے ہیں کیونکہ پرانا فنی شاہ کار، زندہ شاہ کار کے مقابلے میں محفوظ سرمایہ کاری کا دھندہ بھی ہے اور ایک زیادہ مقدس تمدن کی علامت بھی۔ لیکن کچھ آرٹ والے تفاخر پسند جدیدیت والے تفاخر پسند بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں وہ چند سنکی بھی شامل ہیں جو آرٹ کے فن پاروں کو بہ حیثیت فن پارہ پسند کرتے ہیں اور یوں زندہ فن کاروں کو وسیلۂ آمدنی مہیا کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تفاخر پسندی رکھنے والے بن گئے!

ہم میں سے بیشتر مصوّری کی تفاخر پسندی میں مبتلا ہیں۔ فنِ مصوّری کی تفاخر پسندی کی دو قسمیں ہیں ـــــ افلاطونی اور غیر افلاطونی۔ افلاطونی طرز والے، آرٹ میں محض دلچسپی لیتے ہیں۔ غیر افلاطونی آرٹ والے تفاخر پسند اس سے آگے جاتے ہیں اور واقعتاً فن کو خریدتے ہیں۔ افلاطونی آرٹ سے متعلق تفاخر پسندی ثقافت سے متعلق تفاخر پسندی کی ایک شاخ ہے۔ غیر افلاطونی تفاخر پسندی خچر کی طرح دوغلی ہے۔ اسی لئے یہ بیک وقت کلچر والی تفاخر پسندی اور ملکیت والی تفاخر پسندی کی ذیلی قسم ہے۔ آرٹ کے فن پاروں کا ایک ذخیرہ، تمدنی علامات کا ایک مجموعہ ہے اور تمدنی علامتیں بنوزر سماجی وقار کی حامل ہیں۔ یہ دولت کی علامتوں کا بھی ایک مجموعہ ہے کیونکہ کاروں کے ایک پورے بیڑے کے مقابلے میں فن پاروں کا ذخیرہ زیادہ مؤثر سرمایہ کاری کی نمایندگی کرتا ہے۔

بقیدِ حیات فن کاروں کے نزدیک آرٹ والی تفاخر پسندی کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہے۔ بے شک زیادہ تر آرٹ والے تفاخر پسند صرف مرحومین کے فن پاروں کو ذخیرہ کرتے ہیں کیونکہ پرانا فنی شاہ کار، زندہ شاہ کار کے مقابلے میں محفوظ سرمایہ کاری کا دھندہ بھی ہے اور ایک زیادہ مقدس تمدن کی علامت بھی۔ لیکن کچھ آرٹ والے تفاخر پسند جدیدیت والے تفاخر پسند بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں وہ چند سنکی بھی شامل ہیں جو آرٹ کے فن پاروں کو بہ حیثیت فن پارہ پسند کرتے ہیں اور یوں زندہ فن کاروں کو وسیلۂ آمدنی مہیا کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

عمومی حوالے سے تفاخر پسندی کی تعبیر اور اس کا انسانیت سے ہمدردی

اس کی وہ قوت ہے جس کا مقصد کارکردگی کو تحریک دینا ہے۔ ایک معاشرہ

جس میں لاتعداد تفاخر پسند ہوں اس کتے کے مانند ہے جس سے بے شمار پستو

چپٹے ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے کنگھی کی ضرورت ہے۔ ہر تفاخر پسندی

اپنے جاں نثاروں سے غیر مختتم کوششوں اور مسلسل قربانیوں کا تقاضا کرتی

ہے۔ سماجی تفاخر پسند پر لازم ہے کہ وہ ہمہ وقت شیر کا شکار کرے اور جدید

والا تفاخر پسند وقتِ رواں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی سعی کرنے سے

کبھی اجتناب نہیں برت سکتا۔ سوئٹزرلینڈ کے ڈاکٹروں کے سلسلے میں جو

بہترین بات سوچی یا کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ روگ اور ثقافت والے

ایسے تفاخر پسند ہیں جن کے شب و روز انھیں مشاغل میں بسر ہوتے ہیں۔

اگر ہم سرگرمی کو بذاتہٖ ایک اچھائی قرار دیتے ہیں تو پھر ہمیں لازماً تفاخر

پسندیوں کو اچھا شمار کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ سب سرگرمی کو مہمیز لگاتی ہیں۔ اگر

بدھ مت کے پیروکاروں کے نقطۂ نظر سے ہم اس فریبِ نظر کے حامل سارے

سنسار کی سرگرمی کو لغو خیال کریں تو پھر ہمیں تمام تفاخر پسندیوں کی مذمت کرنا

ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے بیشتر دو انتہاؤں کے بیچ کسی مقام پر جم کر

کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم کچھ سرگرمیوں کو اچھا قرار دیتے ہیں۔ باقیوں کو غیر

متعلق یا صریحاً بُرا سمجھتے ہیں۔ ہم صرف ان تفاخر پسندیوں کو قابلِ قبول سمجھیں گے

جو ایسی کارروائیوں کو فعال بنائیں، جنھیں ہم بہتر سمجھتے ہیں۔ باقی سب کو یا

تو ہم برداشت کریں گے یا ان سے بے حد نفرت کریں گے۔ مثال کے طور پر زیادہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پیشہ ور دانشور تمدن کی تفاخر پسندی کو بہ نظرِ استحسان دیکھیں گے۔ (گو اسی لمحے انتہائی منظرد تمدن والے تفاخر پسندوں سے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کریں گے)۔ کیونکہ یہ اُجڈ لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کم از کم ذہن کی سوچوں کو ادنیٰ سا خراج تحسین تو پیش کریں اور یوں خیالات کے معاملے میں دُنیا کو خطرناک حد تک غیر محفوظ ہونے کی حالت سے نجات دلانے میں مددگار ثابت ہوں۔ دوسری جانب موٹر گاڑیاں بنانے والا ملکیت کی بڑائی کو تمدن کی بڑائی سے بلند مرتبہ بخشے گا۔ وہ لوگوں کو اس بات کی ترغیب دلانے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا کہ وہ جو نسبتاً کم چیزوں کے مالک ہیں (خصوصاً چار پہیوں پر قبضہ رکھنے کے حوالے سے) وہ ان لوگوں کے مقابلے میں کم تر درجہ رکھتے ہیں، جن کے پاس زیادہ چیزیں ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ گویا ہر کلیسائی راج اپنے ہی خاص الخاص پوپ کے ذریعے اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ناچیز کوما کی مدح میں

کہتے ہیں کہ دیوتا سانس عطا کرتے ہیں اور مچھر اسے چھین بھی لیتے ہیں۔ یہی بات ناچیز کوما کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے ــــ کیا نہیں کہی جا سکتی؟ اس میں صیغہ کلمہ جاریہ کا اضافہ کر دیں تو یکایک ذہن جیسے لغوی طور پر سوچتے ہوئے رک سا جائے گا۔ اگر آپ کا جی چاہے اور آپ کوما کو نکال باہر کریں یا اُسے نکالنا بھول جائیں تو ایسی صورت میں اس بات کا امکان ہے کہ ذہن ٹھہراؤ کی حالت سے محروم ہو جائے۔ اس کے باوجود کوما کوئی توقیر حاصل نہیں ہے۔ یہ محض ایک لغزش سی لگتا ہے۔ خود نمائی کی ایک ادا یا شعور کے آخری کنارے کی پھڑپھڑاہٹ یا طابع کے ہاتھ پر پڑنے والا ایک دھبہ! ہمارا یہ دعوٰے ہے کہ اختصار میں حُسن ہے (یا خصوص مائیکرو چپ کے اس عہد میں) تاہم اس کے باوجود سانس کے علاوہ وہ کون سی دوسری شے ہے جو کوما کی طرح اتنی زیادہ استعمال میں آتی ہو!

لہ COMMA

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہمیں بتایا گیا ہے کہ اوقاف نگاری میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ وہ امن و آشتی قائم رکھتی ہے۔ اوقاف نگاری کے نشانات سڑکوں کے ان اشاروں کے مانند ہیں جو ہماری گفتگو کی شاہراہ کے کناروں پر نصب ہیں تاکہ رفتار کو قابو میں رکھا جا سکے، سمتوں کی نشان دہی میں سہولت مہیا ہو اور سامنے کی ٹکروں سے محفوظ رہا جا سکے۔ مرکب جملہ میں سُرخ بتی کی سی پلک نہ جھپکنے والی قطعیت ہوتی ہے جب کہ کوما زرد رنگ کی ایک عارضی چمک ہے جو ہمیں محض آہستہ ہو جانے کا اشارہ کرتی ہے۔ دوسری طرف وقفِ ناقص (سیمی کولن) ایک ایسا اشارہ ہے جو ہمیں دوبارہ بتدریج رواں ہونے سے قبل آہستگی سے رُک جانے کو کہتا ہے۔ لفظوں میں باہمی رشتہ استوار کر کے، اوقاف نگاری ان لوگوں کے درمیان ربطِ باہم استوار کرتی ہے جو لفظوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اساتذہ اسے بلند مرتبہ قرار دیتے ہیں جب کہ محبت کرنے والے اس کی حکم عدولی کرتے ہیں۔ (گیرٹی گل مور نے اپنی محبوبہ کو یہ بات لکھ بھیجی کہ "ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی ملکیت ہیں۔ نیکولی: آؤ عہد کریں کہ ہم ایک دوسرے کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے ۔ کبھی بھی نہیں۔") اسے یہ بات تو یقیناً معلوم ہوگی (بقول فاؤلر جو یزی زبان کے روزمرہ کے بادشاہ ہیں) کہ کوما کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ی نہ جدا ہو سکنے والوں کو بھی جُدا کر سکتا ہے۔

بہرحال اوقاف نگاری ایک طرح کی سماجی ٹیکنالوجی کا کام دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا ستون جو معاشرہ کو ایستادہ رکھتا ہے (ایک رواں دواں جملہ جس میں عبارے الگ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

الگ دکھائی دینے کے بجائے محض ایک جگہ ڈھیر ہو جائیں ایسا ہی بھدا نظر آئے گا جیسے کہ برتن دھونے والی وہ نشیبی جگہ جہاں گندے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا ہو۔ لہٰذا یہ اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ اوقاف نگاری وکٹورین عہد کے اوّلین اوصاف میں سے ایک تھی ـــــ وکٹورین عہد جو انگیا پہننے سے عبارت تھا اور جسے جدیدیوں نے مسترد کر دیا۔ جنسی انقلاب کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ اس وقت شروع ہوا ہوگا جب جیمز جائس کے کردار مولی بلوم نے اپنے نجی خیالات کا سارا کچا چٹھا چھتیس صفحات پر مشتمل بے لگام، وقفوں سے تہی سرکاری طور پر سنسر شدہ نثر میں بکھیر دیا تھا۔ ایک اور بغاوت کے حتمی شواہد بھی دکھائی دیتے تھے، جب ای ای کمنگز نے پہلی بار خود کو اس قابل جانا تھا کہ وہ "خداوند" کو نچلے طبقے کے سپرد کر دے

یوں اوقاف نگاری ثقافت کے "دستخط" کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے ـــــ جو شیلی خور رکھنے والا ہسپانوی اپنے دوہری وضع کے کلمات نداسیہ نیز اپنے استفہامی نشانات میں خود کو منکشف کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ بے حس چینی تصویری رسم الخط سے اشاروں کو منہا کرنے کی اپنی روایتی نامنہاد فہم و ادراک سے ماوراء حالت میں مزید اضافہ کر لیتا ہے چھٹی دہائی کی لاقانونیت اور افراتفری دھماکہ خیز استفہامیہ کلمات، بدمست جلی حروف اور ٹائم و وائٹ کی رنگین نثر کے چمکتے انداز میں ظاہر ہوئی تھی، جب کہ اشتراکی معاشروں میں، جہاں ریاست مطلق العنان ہوتی ہے، جلی حروف کا وقار اور الوہیت فقط وزیروں، ذیلی کمیٹیوں اور سیکرٹریوں کے لئے مختص کر دی جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بایں ہمہ اوقاف نگاری تمدن کے پیدائشی نشان سے کچھ زیادہ ہی بڑی شے ہے۔ یہ ہمارے اذہان میں موجود موسیقی کو نشان زد کرتی ہے اور ہماری سوچوں کو ہمارے دل کی تال پہ متحرک ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ اوقاف نگاری ہمارے لفظوں کی رواں موسیقی کا نغماتی زیر و بم ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ کب دم لیا جائے یا کب سُروں کو بلند کیا جائے۔ یہ اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ کسی بھی نوع کے نغمے کی طرح ہماری بات چیت کا معنی اکائیوں میں نہیں بلکہ اوقاف اور فاصلوں میں نہاں ہوتا ہے۔ اوقاف نگاری اس طریق کا نام ہے جس سے انسان اپنی آنکھیں چراتا، آواز کو مدھم کرتا یا شرماتا ہے۔ اوقاف نگاری صوت، رنگ اور زیر و بم کو باہم آمیز کرتی ہے، حتیٰ کہ احساس تک ایک مکمل اکائی میں ڈھل کر سامنے آجاتا ہے۔

مختصراً یہ اوقاف نگاری ہمیں انسانی آواز کے علاوہ وہ تمام مفاہیم بھی عطا کرتی ہے جو الفاظ میں پوشیدہ ہوتے ہیں مثلاً یہ فقرہ کہ "تم جوان نہیں ہو۔ ہے نا؟" اپنی معصومیت گنوا دیتا ہے جب اسے استفہامیہ نشان سے منقطع کر دیا جائے۔ ہر بچے کو معلوم ہے کہ علامتِ حذف سے دستکش

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کا اضافہ کر دیا جائے ——— تو خدا ملکہ کو سلامت رکھے" ایسے الفاظ کی شایانہ بردباری مایوسی سے لبریز چیخ میں ڈھل جائے جو دوہری بے ادبی کی سرحدوں کو چھو رہی ہوتی ہے۔

بلاشبہ بعض اوقات ہماری علامات محض جمالیات کا مسئلہ ہوتی ہیں۔ کوما کو عبارت میں گھسیڑ دینا، گلوبند پہننے کے مترادف ہو سکتا ہے جو لباس کو ایک خاموش سا وقار عطا کرتا ہے یا پھر یہ آبِ رواں کی اس آواز کو پکڑنے کے مانند ہے جو جاپان کے کسی قدرتی منظر کی خاموشی کو مکمل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ جب وی۔ ایس۔ نیپال اپنے تازہ ترین ناول میں لکھتا ہے کہ "وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس نے عینک لگا رکھی تھی"۔ تو اس میں پہلا کوما کچھ نہ کچھ قیمتی دکھائی دے سکتا ہے۔ تاہم یہ بیانیہ کو ایک کروٹ دینے کے علاوہ لطافت بھی بخشتا ہے جس سے بصورت دیگر وہ محروم ہوتا اور یہ (کوما) بتاتا ہے کہ عینک ادھیڑ عمر کا محض ایک حصہ نہیں ہے بلکہ اس سے سوا "کچھ اور" بھی ہے۔

یوں یہ تمام چھوٹی چھوٹی خراشیں ہمیں وسعت اور روزن اور گہرائی بخشتی ہیں۔ وہ دنیا جس کے پاس محض مقررہ وقفے ہوں، ایک ایسی دنیا ہے جس میں آواز کا اتار چڑھاؤ نہیں ہے۔ یہ دنیا بغیر سایے کے ہے۔ اس کی موسیقی کاٹ دار اور ہموار سطحوں سے تہی ہے۔ یہ جنگلی نوع کی موسیقی ہے۔ اس کا آہنگ گرج دار ہے۔ الفاظ نہ تو جھک سکتے ہیں نہ مڑ سکتے ہیں۔ اس کے مقابل ایک کوما، سوچ میں مستغرق ذہن کے اس بہاؤ کو گرفت میں لیتا ہے جو اپنی جانب مڑنے، پیچھے رکنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دوہرا ہونے اور واپس اپنے خیمہ میں نفخے کے دریائی راستے کے ساتھ ساتھ چلنے سے عبارت ہے۔ جب کہ سیمی کولن (فقرے کے) نحوی حصّوں اور خیالات کو اسی طرح یکجا کرتی ہے جس طرح ایک میزبان خاتون اپنی خاموش صوابدید کو بروئے کار لاتے ہوئے مہمانوں کو کھانے کی میز کے گرد ایک خاص ترتیب سے بٹھاتی ہے۔

بہرحال اوقاف نگاری احتیاط کا معاملہ ہے۔ الفاظ کے سلسلے میں احتیاط کا لیکن اس کے علاوہ اور نسبتاً زیادہ اہم بات یہ ہے کہ الفاظ کس قسم کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ صرف ایک عاشق ہی معمولی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے مثلاً یہ کہ کس طرح بعد از دوپہر کی روشنی کی شعاع محبوبہ کی گردن کے پچھلے حصّے کو نمایاں کرتی ہے یا کس طرح بالوں کی ایک لٹ کان کے عقب سے پھسل کر سامنے آجاتی ہے یا کس طرح ایک انگلی پیالی کے گرد بل ڈالتی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی شخص خط کے ایک ایک حرف کی اتنی توجہ سے جانچ پرکھ نہیں کرتا جتنی توجہ سے ایک عاشق اس کے معمولی سے معمولی نشان کی تلاش کرتا ہے۔ اس کی (نازک سے نازک) تفاوت، اس کی ہچکیوں، آہوں اور ہکلاہٹوں کو کوشش کرکے سنتا ہے اور ان مخفی پیغامات پر غور کرتا ہے جو (خط کے) نفاتی زیر و بم میں پنہاں ہوتے ہیں۔ "جیمز (جسے میں چاہتا ہوں)" اور "جیمز، جسے میں چاہتا ہوں" میں جو فرق ہے اور جو فرق ان دونوں میں اور "جیمز ——— جسے میں چاہتا ہوں" میں موجود ہے۔ اس تفاوت کو نشان زد کرتا ہے جو آمنہ اور دل کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

درد میں ہے۔ اساکا بیل کے خوبصورت الفاظ میں "لوہا اتنی قوت سے دل میں پیوست نہیں ہوتا، جتنی قوت سے وہ وقفہ جو صحیح مقام پر نمودار ہوتا ہے۔" یہ کوماہی تو ہے جو ہمیں آوازِ یادل کی شکست و ریخت کو سن سکنے کا موقعہ عطا کرتا ہے۔ فی الحقیقت اوقاف انتظاری محبت کی مشقت کا اعلامیہ ہے جو ہمیں ایک طرح سے دوبارہ دیوتاؤں کے حضور لے جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چارلس لیمب

روبصحت ہونا

چند ہفتے قبل کی بات ہے کہ علالت کے ایک نہایت شدید دورے نے اعصابی بخار کی صورت مجھے میری ذات میں مجبوس کئے رکھا، لیکن اب یہ ڈبے پاؤں الوداع ہو رہا ہے اور مجھے اس حد تک نحیف و نزار کر گیا ہے کہ میں اب اس کے سوا کسی دوسرے نئے موضوع کے بارے میں کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں ہوں۔ لہٰذا محترم قاری! اس ماہ تم مجھ سے کسی قسم کی صحت مند باتوں کی اُمید نہ رکھو۔ میں تو فقط تمہیں صاحب فراش لوگوں کے خوابوں کی پیش کش ہی کر سکتا ہوں۔

سچ پوچھئے تو یہ بیماری والی رُوح پرور کیفیت کچھ اس نوعیت کی ہے — اس کے علاوہ اور کچھ ہو بھی کیا سکتی ہے! کہ یہ آدمی کے لئے ایک سُندر نا ہے — سُپنا کہ وہ بستر پر دراز ہو جاتے اور اپنے اُوپر دن کی روشنی کو کٹنے والے پردے تان لے اور پھر سُورج کی تمازت سے خود کو پوری طرح محفوظ و مامون کر لے تاکہ وہ ان اُمور سے مکمل تغافل برت سکے جو اس کی روشنی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور یہ سب کچھ ایسے ہی ہے جیسے آدمی ایک لاغر سی دھڑکن والی نبض کے سوا دیگر تمام معاملات دُنیا سے یکسر بے نیاز ہو جائے اگر کہیں کوئی شاہانہ طرز کا گوشۂ تنہائی ہے تو وہ فقط بستر علالت ہے۔ مریض اس پر حکومت کرتا ہے اور ہر قسم کی متنوع مزاجیوں کا بغیر کسی روک ٹوک کے مظاہرہ کرتا ہے اور شاہانہ مزاج طور طریقوں سے اپنے تکیے کو آگے پیچھے جنبش دیتا ہے مثلاً وہ اپنی پھڑکتی کنپٹیوں کے مسلسل بدلتے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تکیے کو گراتا ہے، اچھالتا ہے، بار بار اس کی جگہ تبدیل کرتا ہے، اسے دوہرا کرتا ہے اور اس پر زور سے ہاتھ مارتا ہے یعنی کسی سیاست دان سے بھی کہیں زیادہ جلد جلد وفاداریاں بدلتا ہے ـــــ ابھی بالکل چت لیٹا ہے، پھر آدھا سمٹ گیا ہے، اب آڑھا ہو گیا ہے، عرضاً لیٹ گیا ہے، اب حسب ضرورت پہلو بدل رہا ہے۔ اب سر اور پاؤں بالکل بستر کے آر پار کئے ہوئے ہے، لیکن دوسرا کوئی بھی اُسے ان قلابازیوں پر مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔ چار پردوں کے بیچ وہ بالکل شامت ہے۔

علالت تو آدمی پر اس کی اپنی ذات کی اتنی پرتیں منکشف کر دیتی ہے کہ وہ خود کو بھی محض ایک مخصوص شے سمجھنے لگتا ہے اور پھر اس کے ہاں انتہائی خود غرضی بصورت اخلاقی ذمہ داری جنم لیتی ہے جو اس کے لئے قانون کی رو شقوں کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے سوائے اس کے کچھ سوچنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کہ تندرست کیونکر ہوا جائے۔ در و دیوار کے باہر یا ان کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ان سب سمع خراشیوں پر دھیان نہیں دیتا تاکہ وہ اُسے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کوفت نہ پہنچائیں۔

تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے کسی عزیز ترین دوست کے اس مقدمے کی تیاری کے سلسلے میں انتہائی متردد دکھائی دیتا تھا، جو اس کے (یعنی دوست کے لئے) زندگی اور موت کا درجہ رکھتا تھا اور اس ضمن میں اسے بہ ہزار دقت سہی اپنے دوست کی خاطر قصبے سے پچاس کلومیٹر تک کی قلیل مسافت کو جلد از جلد طے کر کے پہنچنا تھا تاکہ وہ اس کے گواہ کو روانہ کرے اور اس کے وکیل کو یاددہانی کرائے کیونکہ کل ہی تو اس مقدمے پر کارروائی ہونا تھی مگر اب وہ خود اس مقدمے کے سلسلے میں کلی طور پر غیر جانب دار نظر آتا ہے، جیسے یہ دور پی کنگ میں ہونے والے کسی مقدمے کی سماعت ہو اور چارہ جوئی سے پہلے ہی کسی نہ کسی طور عدالتی کارروائی کے سلسلے میں یہ سرگوشیاں گردش میں آگئی ہوں کہ عدالت اس مقدمے کی سماعت کے لئے تیار نہیں ہے اور یہیں سے اس کے لئے یہ باور کر لینا کافی ہے کہ کل عدالت میں معاملات خلافِ توقع پیش آگئے تھے اور اس کا دوست تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ لیکن اب لفظ "دوست" اور لفظ "برباد" اس کے نزدیک ایک چھوٹی بولی سے قطعاً زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اسے چنداں ضرورت نہیں کہ وہ کسی چیز کے متعلق مرکھپائے سوائے اس بات کے بارے میں کہ کس طرح رو بہ صحت ہوا جائے ــــ کیسی اچھوتے خیالات کی حامل دنیا اس سوچ بچار والی مسحور کن کیفیت سے آشکار ہوتی ہے!

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس نے اپنی علالت کی مضبوط زرہ بکتر پہن لی ہے، وہ نامساعد حالات کی کھال میں لپیٹا جا چکا ہے۔ وہ اپنی ہمدردی کو کسی انمول دخترِ رز کے مانند قابلِ اعتبار تالے چابی میں سنبھال کر رکھتا ہے لیکن فقط اپنے استعمال کی خاطر ہی! وہ لیٹے لیٹے خود ترحمی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اپنی حالتِ زار پر گریہ کرتا اور آہیں بھرتا ہے اور اپنے اوپر ہی فدا ہوتا رہتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ وہ کیا کچھ بھوگ رہا ہے اس کے فضلات بھی خود اس کے اندر ہی اندر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ وہ خود پر آنسو بہانے میں قطعاً عار محسوس نہیں کرتا اور وہ ہمہ وقت اس منصوبہ بندی میں مشغول رہتا ہے کہ خود کو جیسے تیسے خوشی بہم پہنچائے ـــــ معمولی مطالعہ والی ترکیب سے، مصنوعی ترغیبات کی امداد سے ـــــ وہ اپنے سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے کرتا ہے۔ ـــــ اپنے آپ کو قابلِ حصول فکشن کے مطالعہ کے ضمن میں اتنے ہی زیادہ سے زیادہ تعداد کے ممتاز افراد میں تقسیم کر لیتا ہے جتنے کہ اس کے اپنے دکھی اور مغموم افراد خانہ ہوں۔ بعض اوقات وہ کچھ یوں مستغرق ہو جاتا ہے جیسے وہ اپنے سے باہر کوئی اور وجود رکھتا ہو ـــــ کہ جس کے دکھتے ہوئے غریب سر کے اوپر ایک مستقل نوعیت کا بوجھل درد موجود ہے جو گزشتہ تمام شب اس کے اندر لیٹے لیٹے سوتا اور جاگتا رہا ہے اور کسی لکڑی کی گیلی یا درد کے وجود کی صورت میں اسے لگاتار محسوس ہوتا رہا۔ پہ اور جیسا کہ نظر آ رہا ہے۔ یہ شاید اس سے تب تک ختم نہ ہو سکے گا جب تک اس کی پوری کھوپڑی کو آگے تک کھول کر نہ رکھ دیا جائے۔ پھر وہ اپنی لکڑی جیسی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لمبی خشک اور پتلی یخ بستہ انگلیوں پر رحم کھانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ خود ہی پوری طرح اپنے آپ پر ترس کھانے والا بن جاتا ہے۔ گویا اس کا انسانیت سے معمولی نہایت دردمندی سے ترتیب دیا ہوا ہے۔ وہ خود ہی اپنا پُرسانِ حال ہے، اپنے آپ سے ہمدردی جتلانے والا ہے اور حتمی طور پر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ دوسرا کوئی بھی شخص اس کے مقابلے میں بہتر طریق سے یہ فریضہ انجام دینے پر قادر نہیں۔ وہ اپنے اس ایثار کے لئے کسی قسم کے ناظر کی پروا نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں صرف اس ضعیف العمر نرس کا پابندِ وقت چہرہ اُسے بھاتا ہے جو اس کے لئے تیار شدہ یخنیوں اور مفرح چیزوں کی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ وہ اس چہرے کو پسند کرتا ہے کیونکہ یہ اس وقت تک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس کے روبرو کپکپی والے جھٹکوں کے ساتھ، اپنے بستر کی چوکی پر پیچھے کو ٹیک لگا کر لیٹے لیٹے ہی ان چیزوں کو اپنے اندر انڈیل نہ لے۔

معاملاتِ دُنیا کے اعتبار سے وہ مر چکا ہے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتا کہ فانی لوگوں کی مصروفیات اور مشاغل کس نوعیت کے ہیں۔ اسے صرف اس کے کچھ کچھ اس قسم کا تھوڑا بہت جھلملاتا ہوا سا وہم گزرتا ہے جب ڈاکٹر اپنی معمول کی پُرسشِ احوال پر آتا ہے۔ ڈاکٹر کے معروف کار چہرے پر اُبھری ہوئی شکنوں سے مریضوں کی کثرت کا اسے قطعاً کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا کیونکہ وہ اپنے تئیں نہایت غیر محسوس طور پر یہ خیال کرتا ہے کہ جیسے وہی تو واحد مردِ بیمار ہے۔ کسی تکلیف دہ بگھی پر سوار ہونے کے لئے یہ بھلا آدمی اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ کو دھکے وغیرہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر اسے نہایت احتیاط سے لپیٹے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوئے جب بڑی عجلت میں اپنے پیغمبر سے بیان ہوتا ہے تو کیا اسے اس بات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کس کو مخاطب کرنے جا رہا ہے؟ —— وہ تو روزانہ محض عین اُسی وقت کے معمول والے پھیرے کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے۔

امورِ خانہ داری سے متعلق افواہیں اُسے قطعاً نہیں بھاتیں، کچھ معمولی نوعیت کی سرگوشیاں جو گھر کے اندر رواں دواں زندگی کی مظہر ہیں —— اسے تسکین مہیا کرتی ہیں جب کہ وہ بخوبی اس بات سے آگاہ نہیں کہ ان کی نوعیت کیا ہے! اسے کسی چیز کے متعلق کچھ جاننے یا کسی چیز کے بارے میں کچھ غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدمت گزاروں کا فاصلے پر موجود سیڑھیوں کے اوپر چڑھنا یا اترنا یوں جیسے کہ وہ مخمل کے اوپر محتاط قدموں سے چل پھر رہے ہیں، اس کی سماعت کو اس لمحے تک غیر محسوس طور پر بیدار کئے رکھتا ہے جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو مزید ان کے قلیل مسافت طے کرنے کے عمل سے متعلق قیاس دوڑانے والی پُر مشقت اذیت سے باز نہ رکھ لے۔ زیادہ علم و فضل اس کے لئے ایک بارِ گراں ہے۔ وہ تو بمشکل ایک مفروضے کا ہی بوجھ برداشت کر سکتا ہے۔ وہ صفائی ستھرائی کرنے والے کی جھاڑ پونچھ کی آواز سُن کر آنکھیں آہستگی سے وا کرتا ہے اور یہ پوچھے بنا کہ وہ کون تھا، دوبارہ اپنی آنکھیں موند لیتا ہے۔ وہ اس عمومی بازپرس پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا کہ اس کے متعلق استفسارات ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ پوچھنے والے کا نام جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ گھر کی عمومی خاموشی اور کرب انگیز ٹھہراؤ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میں وہ بالکل چت لیٹ کر اپنی اس مطلق العنانی کو محسوس کرتا ہے۔

علیل ہونے کا مطلب ہے شاہانہ طرز کے امتیازی استحقاق سے لطف اندوز ہونا۔ محتاط قدموں والی چال اور چپ چاپ قسم کی خدمت گزاری کا موازنہ فقط آنکھ کے وسیلے ہی سے ممکن ہے کہ جس میں سے یہ ساری خدمت گزاری (جب کہ وہ خود کو نسبتاً بہتر محسوس کر رہا ہو) تو عدم توجہی پہ مبنی رویے اور پہلے والے خدمت گزاروں کی اندر اور باہر آنے جانے والی غیر رسمی کارروائی۔ (یعنی دروازوں کو دھڑام سے بند کرنا یا انھیں کھلا ہی چھوڑ جانا) بخوبی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ اور آپ تو اس بات کو تسلیم کریں گے کہ بستر علالت (مجھے کم از کم اسے تختِ شاہی کہنے کی اجازت دیجئے) سے اتر کر آرام دہ بازوؤں والی کرسی تک آنا، مرتبے سے گرنا اور بے وقعتی کا شکار ہونا ہے۔ دیکھئے کہ روبصحت ہونے کا عمل کس طرح آدمی کو سکیڑ کر دوبارہ اسے اس کی اوّلین ہیئت میں بدل ڈالتا ہے! جس جگہ اب خلا ہے اور جہاں پر وہ خود اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کے اندازے سے بڑی تاخیر سے قبضہ جما پایا ہے ـــــ اس کی شاہانہ عظمتوں کا نظارہ، اس کا کمرۂ عدالت جو کہ اس کی جلوہ نمائی والی خلوت گاہ تھا ـــــ جہاں دراز ہو کر وہ اپنی متشدد اور متلوّن سوچوں کو عملی جامہ پہنایا کرتا ـــــ کس طرح سمٹ کر ایک عام سی خواب گاہ بن گیا ہے: اس ایک سرد والی نِک سُک سے دُرست حالت کچھ یوں ہی سی اور بے معنی سی رہ گئی ہے جسے اب روزانہ سنوارا جاتا ہے اور یہ اُن لہریلی اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سینکڑوں سلوٹوں والی سطح بجر سے کس قدر مختلف ہے جو اگلے وقت کے حساب سے اب کچھ انتہائی قلیل مدت کے دورانیہ کے بعد نمودار ہونے لگی ہے۔ جب کہ پہلے پہل اس کو سنوارنے والا فریضہ ادا کرنے کے لئے تین یا چار روز سے پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان دنوں بیچارے مریض کو درد اور اذیت کے باوجود کچھ دیر کے لئے صفائی ستھرائی والی ناخوشگوار دخل اندازیوں کے نام پہ (جن پہ اس کا جھنجھوڑا ہوا وجود ناپسندیدگی کا اظہار کرتا) بستر پہ سے اٹھا لیا جاتا تھا اور پھر آئندہ تین یا چار دنوں تک کے آرام دہ وقفے کے بعد اسے اٹھا کر دوبارہ اسی بستر پہ لٹا دیا جاتا تھا تاکہ وہ دوبارہ اس پہلی سی صورتِ حال میں تبدیل ہو جائے جس میں بستر پہ پڑنے والی ہر تازہ شکن کسی بدلے ہوئے زاویے، کسی تکلیف دہ کروٹ یا قدرے سکون آور جنبش پہ مبنی ایک تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی تھی اور جلد کا ٹکڑا ہوا داغ، بستر کو ڈھانپنے والی چرمی چادر کے مقابلے میں زیادہ سچی کہانی سناتا تھا اور وہ پُراسرار آہیں اور خوفناک ہچکیاں جو ضرورت سے کچھ زیادہ تکلیف دہ ہوں، آنا بند ہو جاتی تھیں۔ اس وقت ہمیں اس بات کا علم تک نہیں ہو پاتا تھا کہ یہ سب کس نوع کے پُراذیت طویل و عریض مخفی غار سے برآمد ہوئی تھیں ـــــ درد کی ٹیسیں مدھم ہو چکی ہیں۔ علالت کی پہیلی بُوجھی جا چکی ہے اور فیلوس ایک ادنیٰ شخص بن کر رہ گیا ہے۔ شاید بیمار آدمی کے عالی شان خواب دیکھنے کی کچھ باقیات طبی خدمت گار کی ہنوز جاری رہنے والی مختصر سی پُرسشِ احوال کی شکل میں موجود ہیں، لیکن

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

وہ خود دُوسری تمام چیزوں کی طرح کس قدر تبدیل ہوگیا ہے! کیا یہ وہی شخص ہے ـــــ وہی باخبر آدمی، خوش گپیاں لگانے والا اور چٹکلے سنانے والا جو سبھی کچھ تھا بجز ایک طبیب کے؟ ـــــ کیا یہ وہی ہے جو مریض اور اس کے ظالم دشمن کے بیچ آ کھڑا ہوا تھا جیسے کہ وہ فطرت کا کوئی ایسا مقدس پیغام بر ہو جس نے اپنے آپ کو عالی مرتبت مجلسِ مراقبہ میں ایستادہ کر لیا ہو؟ ـــــ خدایا! یہ شخص تو اب کوئی بڑھیا نظر آتا ہے!

اس کے ساتھ ہی وہ سبھی کچھ رخصت ہو جاتا ہے جو بیماری کو عالی شان بناتا ہے ـــــ وہ دورانیہ کہ جس نے گھر کے کام کاج کو ٹھپ چند کر کے رکھ دیا تھا ـــــ صحرا جیسا سکوت جو ہمہ وقت ایک تواتر کے ساتھ محسوس ہوتا تھا۔ "مُنّم بگم" نوعیت کی مریض کے پاس رہنے والی حاضری ـــــ آنکھوں ہی آنکھوں میں کی جانے والی پُرسشِ احوال ـــــ اب تلک محسوس کی جانے والی نازک تر لطافتیں ـــــ رُوح اور علالت کی یکہ و تنہا نگاہ جو خود پر مرتکز رہتی تھی ـــــ جس میں سے باقی ماندہ تصوراتِ دُنیا منہا ہو جاتے تھے۔ ـــــ دُنیا جو آدمی کے اندر رچی بسی ہوتی ہے ـــــ جس کا اپنا ایک رہس ہے:

دیکھو وہ ایک داغ میں تبدیل ہو گیا

مدیرِ محترم! مجھے تمہاری چٹھی ملی جس میں ایک عدد مضمون کی فرمائش کی گئی ہے، مگر ایسے حالات میں کہ میں رُو بصحت ہونے کی اس غیر متغیر دلدل میں جکڑا پڑا ہوں جسے بیماری کا جوار بھاٹا اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے اور مکمل صحت یابی کی توانا حالت سے بہت دُور ہے ـــــ تمہاری اس

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

فرمائش کو پورا کرنا میرے لئے کتنا دشوار ہے ـــــ کیونکہ فقرہ بازی (ہرچند کہ وہ لغو ہوتی ہے) کا ملکہ مجھ میں ماند سا پڑ گیا ہے ـــــ بے وقت کے اس اطلاع نامے نے اس بیہودہ کاروبارِ حیات اور متحرک زندگی سے از سرِ نو میرا ناطہ جوڑ دیا ہے جو میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور انہماکِ ذات کی اس خواب آگیں حالت سے مجھے منقطع کر دیا ہے جس میں میں عرصۂ دراز تک بحالتِ بیماری پڑا رہا ـــــ وہ حالت جس میں مجھے دُنیا کی مملکتوں اور ان کے ادب اور قانون سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم مراق کی یہ حالت اب ختم ہونے کو ہے۔ میرے متخیلہ کا وہ پھیلاؤ جو بیمار آدمی کے ہاں اپنے انفرادی دُکھ کا عرفان حاصل کرنے کے عمل میں مزید پھیل جاتا ہے۔ اب سمٹنے لگا ہے اور خود پسندی کا وہ دیو (جو میں بن چکا تھا) اب دوبارہ اپنے فطری قد میں لوٹ آیا ہے، یعنی وہ ایک معمولی سے انشائیہ نگار کے کمزور اور ناتواں پیکر میں ایک بار پھر ڈھل گیا ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہنری تھوریو

رات اور چاندنی

چند برس قبل کی بات ہے کہ ایک چاند رات کی چاندنی میں جب مجھے ایکٹ دگاٹ چہل قدمی کرنے کا موقع میسر آیا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں مزید ایسی سیریں کروں گا اور یوں فطرت کے ایک نئے رُخ سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا میں نے ایسا کر دکھایا ہے!

پلینی کے مطابق سرزمینِ عرب میں کسی جگہ پر ایک پتھر موجود ہے جو SEL-ENITES کہلاتا ہے "جس میں ایک ایسا سفیدپن ہے جو چاند کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے" میرا رسالہ بھی گزشتہ ایک دو برسوں سے اسی حوالے سے SELENITIC بن گیا ہے۔

کیا ہم میں سے بہت سوں کے نزدیک آدھی رات وسطی افریقہ کے مماثل ہی ہے؟ کیا ہمیں اس سے یہ ترغیب نہیں ملتی کہ ہم اس کی جھیل TCHAD کے ساحلوں میں داخل ہو جائیں اور دریائے نیل کے اصل منبع کو ڈھونڈ نکالیں؟ مائید چاند کی پہاڑیوں کو بھی؟ کسے خبر ہے کہ وہاں کیسی زرخیزی اور حُسن ہمیں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور سچائی میسر آئیں؟ چاندی پہاڑیوں میں سب کے وسطی افریقہ میں ایسے مقام بھی ہیں جہاں نیل ایسے دریاؤں کے سرچشمے خوابیدہ ہیں۔ ابھی تک نیل کو کھوجنے والی مہمات محض آبشاروں تک جا سکی ہیں یا شاید سفید نیل تک، لیکن سیاہ نیل تک نہیں جس سے ہمیں سروکار ہے۔

میں محسن کہلاؤں گا اگر میں رات کی مملکت کے کچھ حصہ پر فتح یابی حاصل کر لوں یا میں اخبار نکالنے والوں کو اردگرد ہونے والے قابل توجہ موسمی واقعات کی اطلاع دوں یا میں لوگوں کو دکھا سکوں کہ ایک طرح کا حسن ہے جو جاگ رہا ہوتا ہے جب کہ وہ نیند میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ یا میں شاعری کی حدود کو کشادہ کروں۔

رات واقعتاً دن کے مقابلے میں زیادہ نرالی اور کم سنجس چیز ہے۔ میں نے جلد ہی جان لیا ہے کہ میں محض اس کے ٹھلیے سے شناسا ہوں، اور جہاں تک چاند کا معاملہ ہے تو میں نے اس کا اتنا ہی دیدار کیا ہے جتنا کہ یہ کبھی کبھار کواڑ کی جھلملی درز میں سے نظر آتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس کی چاندنی میں کچھ دور تک چہل قدمی کر لی جائے؟

فرض کیجئے کہ آپ ان اشارات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو چاند ایک ماہ کے اندر کرتا ہے (ہر چند کہ اس کا یہ عمل بے نتیجہ ہی رہتا ہے) اور پھر بتائیے کہ کیا یہ ادب یا مذہب میں موجود مواد سے کوئی مختلف نوعیت کی شے ہے؟ لیکن کیوں نہ اس "سنسکریت" کا مطالعہ کیا جائے؟ کیا فرق پڑتا ہے اگر جانا اپنی شاعری سے لبریز دنیا، اپنی پُراسرار تعلیمات اپنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

الہامی اشارات اور قیاسات کے ساتھ آیا ہے اور آ کر چلا گیا ہے ـــــ چاند ایک ملکوتی ہستی ہے جو میرے لئے اشارات سے لدا ہوا آتا ہے اور ایک میں ہوں کہ جس نے اس سے کوئی فائدہ تک حاصل نہیں کیا؟ گویا چاند بغیر توجہ حاصل کئے رخصت ہو گیا ہے!

میرا خیال ہے کہ یہ ڈاکٹر چالمرز ہی تھے، جنھوں نے کولرج پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ جہاں تک اس کا معاملہ تھا وہ ان خیالات کو پسند کرتا تھا، جن کو وہ اپنے اردگرد پھیلا ہوا دیکھ سکے نہ کہ اُس قسم کے خیالات کو جنھیں دیکھنے کے لئے اسے عالمِ بالا کی طرف لازماً دیکھنا پڑے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا شخص چاند کی طرف کبھی نہیں دیکھے گا کیونکہ وہ اپنا دوسرا رُخ ہمیں نہیں دکھاتا۔ وہ روشنی جو خیالات میں سے پھوٹتی ہے، جن کا مدار زمین سے اتنے ہی فاصلے پر ہے اور جو رات کے مسافروں کے نزدیک چاند اور ستاروں کے مقابلے میں کسی طور کم دل بڑھانے اور کم روشن کرنے والی شے نہیں ہے۔ اسے قدرتی طور پر ایسا شخص مطعون ٹھہرائے گا اور اس کا مذاق اڑائے گا ـــــ خیر آپ تو رات ہی کو سفر کیجئے۔ جب چاند آپ کے لئے روشنی کا اہتمام کرے، لیکن میں اُس کم سے کم جسامت والے ستارے کی روشنی کا بھی شکر گزار ہوں جو مجھ تک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی ہے۔ سے بڑے یا چھوٹے اس لئے ہیں کہ وہ ہمیں یوں ہی دکھائی دیتے میں ممنون ہوں کہ میں سماوی تصور کے کم از کم ایک پرت کو، قوس کے ایک رُخ کو اور غروبِ آفتاب کے وقت کے آسمان کو دیکھنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پر قادر ہوں۔

لوگ باگ کافی تیز و طرار انداز میں چاند کی چاندنی کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ گویا وہ اس کی خصوصیات سے بخوبی واقف ہوں اور ان خصوصیات کو اتنا ہی حقیر سمجھتے ہیں جتنا کہ اُلو سورج کی روشنی کو ـــــ انھیں جب وہ حالت خواب میں ہوتے ہیں آپ کے سورج کی روشنی درکار نہیں ہوتی (گو وہ اس لفظ کے معنی کو سمجھ نہیں پاتے) چاہے بیدار ہونے کی صورت میں یہ ان کے لئے کتنی ہی سود مند کیوں نہ ہو۔

اس بات کو مان لینا چاہئے کہ چاند کی چاندنی، ہر چند کہ وہ ایک غمگین راہرو کے لئے کافی روشنی ہے اور ہماری اس باطنی روشنی سے غیر مطابق بھی نہیں جو ہم میں موجود ہے، تاہم یہ معیار اور شدت کے اعتبار سے سورج کی روشنی کے مقابلے میں کمتر ہے۔ لیکن چاند کو محض چاندنی کی مقدار کے حوالے سے نہیں جانچنا چاہئے جو وہ ہمیں مہیا کرتا ہے، بلکہ ان اثرات کے حوالے سے بھی دیکھنا چاہئے جو وہ زمین اور اہل زمین پر مرتب کرتا ہے۔ ـــــ "چاند زمین کی طرف کھینچتا ہے اور جواب آں غزل کے طور پر زمین چاند کی جانب"۔ وہ شاعر جو چاند کی چاندنی میں چہل قدمی کرتا ہے اپنی سوچ کی اس موج سے باخبر ہوتا ہے جو قمری اثرات کا نتیجہ ہے۔ میں اب اپنے خیالات کی موج کو دن کے موجود انتشار سے متمیز کرنے کی سعی کروں گا۔ یعنی میں اپنے سامعین کو متنبہ کروں گا کہ وہ میرے خیالات کو دن کی روشنی کے معیار پر جانچنے کی جسارت نہ کریں۔ بلکہ اس بات کو سمجھنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی کوشش کریں کہ میں رات کے اندر سے بول رہا ہوں۔

زیادہ تر لوگ دن کو گھومتے ہیں۔ رات کو کوئی نہیں گھومتا۔ یہ ایک بالکل مختلف قسم کی رُت کا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر جولائی کے مہینے کی کسی ایک شب کو لیجئے۔ قریباً رات دس بجے کے لگ بھگ ــــ جب انسان نیند میں غرق ہوتا ہے اور دن اسے پوری طرح فراموش ہو چکا ہوتا ہے ــ اس وقت چاند کی چاندنی کا حسن ان تنہا چراگاہوں پر پھیلا ہوا دیکھا جا سکتا ہے، جہاں مویشی خاموشی سے چر رہے ہوتے ہیں۔ چاروں طرف نرالی اشیاء اپنے آپ کو پیش کر رہی ہوتی ہیں۔ سورج کے بجائے اب وہاں پر مہ و انجم بکھرے ہوتے ہیں اور ہُدہُد کے بجائے وہاں پر نادان دبیپ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مرغزاروں میں تتلیوں کے بجائے، جگنوؤں کے پر آگ کی چنگاریاں چھوڑتے نظر آتے ہیں! کون اس سب پر یقین کرے گا؟ کس نوع کی خنک محتاط زندگی آگ کی ایک چنگاری سے جڑ کر ان شبنمی مسکنوں میں رستی بستی ہے؟ چنانچہ اسی لئے آدمی کی آنکھوں میں خون یا دماغ میں آگ بھری ہے۔ نغمہ سنج مینڈکوں کی بجائے، پرواز کرتی ہوئی کوئل کی رُندھی ہوئی کوک۔ مینڈکوں کی ٹراٹراہٹ اور جھینگروں کے شدید تر ہوتے خواب موجود ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ مینڈک نما عجیب و غریب چنگھاڑیں ہی آنی سے جارجیا تک گونجتی ہیں۔ آلوؤں کی بیلیں کل سیدھی کھڑی ہوتی ہیں، مکئی کے پودے ایک دوسرے سے فاصلے پر لگتے ہیں، جھاڑیاں بڑی بڑی دکھائی دیتی ہیں اور اناج کے کھیت بے پایاں پھیلے ہوتے ہیں۔ ہمارے کھلے دریاؤں کی چپوتر انما سطح جسے کسی زمانے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

میں انڈین کاشت کرتے تھے۔ اس زمین پر اب یہ کھیت فوج کی طرح قابض دکھائی دیتے ہیں — اور ان کے سر ہوا میں جھوم رہے ہوتے ہیں۔ کوتاہ قد درخت اور جھاڑیاں عین درمیان میں یوں اُگی نظر آتی ہیں گویا طغیانی سے برباد ہو چکی ہوں۔ چٹانوں اور درختوں، جھاڑیوں اور پہاڑیوں کے سائے ان اشیاء کے ٹھوس اجسام سے زیادہ نمایاں لگتے ہیں۔ سطح زمین کی معمولی سی ناہمواریاں بھی سایوں کی وساطت سے آشکار ہو جاتی ہیں اور پاؤں جن چیزوں کو نسبتاً ہموار پاتا ہے وہ انجام کار کھردری اور ٹیڑھی ترچھی برآمد ہوتی ہیں۔ اسی کارن تمام کا تمام منظر نامہ دن کے برعکس زیادہ بوقلموں اور باتصویر نظر آتا ہے۔ چٹانوں کے بیچ کے انتہائی معمولی فاصلے دھندلے اور غار نما معلوم ہوتے ہیں اور جنگل کی جھاڑیاں گرم سیر خطوں کے دیو قامت درختوں جتنی جان پڑتی ہیں۔ شیریں فرن اور نیل کی جھاڑیاں جنگل کی پگڈنڈیوں پر بے تحاشا اُگی ہوتی ہیں۔ آپ کو کمر کمر تک شبنم میں بھگو ڈالتی ہیں۔ شاہ بلوط کے پتے یوں لش لش کرتے نظر آتے ہیں گویا کوئی سیال مادہ ان پر تیر رہا ہو۔ درختوں کے درمیان پانی سے لبریز گڑھے ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے وہ آسمان کی طرح روشنی سے لبریز ہوں۔ "دن کی روشنی اُن کے سینوں میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔" جیسا کہ پوران نے سمندر کے بارے میں کہا تھا۔ تمام سفید اشیاء دن کے برعکس ممتاز تر ہو جاتی ہیں۔ فاصلے پر موجود ایک چوٹی، پہاڑ کنارے پر موجود فاسفورس زدہ جگہ کی طرح نظر آتی ہے۔ جنگل کے بعید ترین گوشوں میں بھی چاند کی چاندنی، درختوں کے ٹھنٹھوں میں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے خود کو منعکس کرتی ہے گویا اس نے وہ جگہ انتخاب کرلی ہو جس کو اسے جگمگانا ہے۔ اس کی روشنی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے انسان کو اس پودے کی یاد دلاتے ہیں جو نخلِ ماہتاب کہلاتا ہے ـــــ گویا چاند انھیں ان جگہوں پر کاشت کر رہا ہو۔

رات کو آنکھیں جزوی طور پر مُندھی ہوتی ہیں یا سر کے اندر راستہ راست کرنے چلی جاتی ہیں اور دوسری حسیات فعال ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پیدل چلنے والا شامہ کے ذریعے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ہر پودا اور کھیت کھلیان اور جنگل اپنی باس کو پھیلاتا ہے۔ سبزہ زار میں دلدل کی اور سڑک کنارے خوشبودار تینسی کی مہک پھیل جاتی ہے، اور پھر وہاں خشک مکئی کی انوکھی باس ہوتی ہے، جب اس پر پُھندنے آنا شروع ہوتے ہیں، سامعہ اور شامہ دونوں نسبتاً زیادہ چاق و چوبند ہو جاتی ہیں۔ ہم چشموں کی وہ چہا چہن سننے لگتے ہیں جو اس سے قبل ہماری گرفت میں کبھی نہیں آئی تھی۔ وقتاً فوقتاً ٹیلوں کی بالائی سطحوں کے کناروں پر آپ بادِ گرم کے اس تھپیڑے سے بھی آشنا ہوتے ہیں جو دوپہر کے گھمس والے میدانوں سے گزرتا ہوا آن پہنچا ہے، جو دوپہر کی تپتی موج والے اوقات اور ساحلوں اور بھٹوں پر سے پسینہ پونچھتے مزدوروں اور پھولوں میں بھنبھناتی ہوئی مدھ مکھیوں کی خبر لاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ہوا ہے جس میں مشقت شامل ہے، سے لوگ اپنا سانس بنا چکے ہیں۔ یہ ہوا جنگل کنارے سے لے کر پہاڑی کے ملو تک گردش کرتی رہتی ہے۔ اس کتے کی طرح جس نے غروبِ سورج کے بعد اپنے آقا کو گم کر دیا ہو۔ چٹانیں رات بھر سورج کی اس تپش کو سنبھالے رہتی ہیں جسے انھوں نے دن میں جذب کیا تھا اور یہی معاملہ ریت کا بھی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہے۔ اگر اس کے اندر چند انچ تک کھدائی کریں تو آپ اس میں ایک گرم تہ پائیں گے۔ نصف شب کے وقت چراگاہ میں آپ کسی ننگی پہاڑی کی چوٹی پر کسی چٹان پر بیٹھ کے بل لیٹ جاتے ہیں اور ستاروں بھرے آسمان کے چھتر کی بلندی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ستارے، شب کے زیورات ہیں اور شاید ہر اس شے سے برتر ہیں جو ہمیں دن کے وقت نظر آتی ہے۔

ان لوگوں کے لئے جو اپنے بچھونوں میں سوئے پڑے ہیں۔ یہ بات پریشان کن نہیں ہے۔ لیکن ایک مسافر کے لئے یہ بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ کیا چاند کو آب و تاب سے چمکنا چاہیئے یا دھندلے انداز میں! زمین کے متین انبساط کو جب وہ بغیر کسی قسم کی رکاوٹ کے چمکنا شروع کر دیتی ہے محسوس کرنا آسان نہیں ہے۔ جب تک کہ آپ کو اکثر چاندنی راتوں میں تن تنہا پردیس جانے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ چاندنی آپ کی خاطر ابر پاروں سے ایک مسلسل جنگ لڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہم بادلوں کو اس کا دشمن متصور کرتے ہیں۔ وہ اپنی روشنی سے اپنے خطرات کو بڑھاتی چلی جاتی ہے اور انھیں ان کی بھرپور جسامت اور سیاہی کے ساتھ منکشف کرتی ہے۔ تب اچانک انھیں اپنے عقب میں دھندلی روشنی کے اندر پھینک دیتی ہے اور خود فتح مندی سے اپنا راستہ کھلے آسمان کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں بنا لیتی ہے۔

مختصراً یہ کہ چاند اپنی راہ کے چھوٹے چھوٹے ابر پاروں کو عبور کرتے ہوئے یا بظاہر ان کے پار جاتے ہوئے، کبھی ان کے باعث مدھم ہو کر اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کبھی ان کے اندر سے چمکتے ہوئے، چاندنی رات کو تمام دیکھنے والوں کے لیے نیز رات کو سفر کرنے والوں کے لئے ایک تمثیل سی بنا دیتا ہے۔ ملاح اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چاند بادلوں کو نگل رہا ہے۔ مسافر بھی تن تنہا ہوتا ہے اور چاند بھی، بجز اس ہمدردی کے جو اس کے ساتھ ہوتی ہے اور یہ چاند جنگلوں اور جھیلوں اور پہاڑیوں کے اوپر بادلوں کے پورے فوجی دستوں پر غالب آ رہا ہوتا ہے۔ جب وہ آسمان پر کسی کھلے قطعے کے وسیع حصے میں داخل ہو کر بغیر کسی رکاوٹ کے چمکتا ہے تو خوشی سے کھل اٹھتا ہے اور جب وہ دشمن کے ایک پورے دستے سے نبرد آزما ہو کر اپنے لئے راستہ بنا لیتا ہے اور بے داغ آسمان پر شاہانہ طریق سے سواری کرتا ہے اور مزید کسی قسم کی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں تو وہ خوشی بخوشی پورے اعتماد کے ساتھ اپنا راستہ تلاش کرتا ہے اور دل ہی دل میں مسرور ہوتا ہے۔ اس وقت یوں لگتا ہے جیسے جینگر بھی اپنی مسرت کا اظہار نغمے کی صورت میں کر رہا ہے۔

وہ دن کتنے بے کیف ہوتے ہیں جب رات اپنے شبنمی قطروں نیز تیرگی کے ہمراہ پژمردہ ہوتی دنیا کو بحال کرنے کے لئے نہ آ سکے! جوں ہی سائے ہمارے گرد اکٹھا ہونے لگتے ہیں، توں توں ہماری قدیم جبلتیں بیدار ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور ہم چپکے چپکے اپنے اندر سے کسی جنگلی کی طرح نکل آتے ہیں، ان خاموش اور مغموم سوچوں کی تلاش میں جو عقل کا قدرتی صید ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

رچٹر کہتا ہے کہ زمین ہر روز رات کی چادر سے ڈھانپ دی جاتی ہے، اسی اصول پر جس کے تحت پرندوں کے پنجروں میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے ——— تاکہ ہم مستعدی سے سوچ کی بلند تر ہم آہنگیوں کا تصور اندھیرے کی خاموشی اور سکوت میں کر سکیں۔ سوچیں: جنھیں دن، دھوئیں اور دُھند میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں جیسے مجسم روشنی اور شعلے ہوں۔ بعینہٖ جیسے وہ مینار جو آتش فشاں وسیووس کے گڑھے کے اُوپر جلتا بجھتا، دن کو بادل کا ایک ستون معلوم ہوتا ہے، لیکن رات کو آگ کا ستون بن جاتا ہے۔

اس آب و ہوا میں ایسی راتیں بھی آتی ہیں جو اس سکون اور شاہانہ خوبصورتی سے عبارت ہوتی ہیں جو روح کے لئے اس قدر شافی اور اس کی تخلیق کاری کے لئے اس قدر محرک ہے کہ میں سوچتا ہوں، حساس فطرت انھیں کبھی فنا نہیں ہونے دے گی اور غالباً ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو اپنے گھر سے باہر ایسی راتیں بسر کر کے خود کو بہتر اور زیادہ عقلمند محسوس نہ کرتا ہو! چاہے بطور تلافی اُسے پورا دن سو کر ہی کیوں نہ گزارنا پڑے۔ ایسا شخص ایڈی آن کی نیند سوئے گا جیسا کہ قدما نے اسے بیان کیا تھا ——— یہ راتیں امروسیہ کے یونانی لقب سے موسوم ہو جانے کے قابل ہیں، یعنی بیولال کی سرزمین میں ماحول شبنمی مہک اور موسیقی سے فعال ہو جاتا ہے اور ہم نیند میں کھو جاتے ہیں اور اپنے خوابوں کو بیدار کر لیتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہندو لوگ چاند کا موازنہ اس پوتر ہستی سے کرتے ہیں جو اپنے جسمانی وجود کی آخری سرحدوں تک پہنچ چکی ہو۔

اے قدیم زمانے کا احیا کرنے والے عظیم ساحر! نرم ملائم رات میں جب فصل کٹنے کے زمانے یا شکار کرنے کے ایام ہیں چاند بغیر کسی رکاوٹ کے چمک رہا ہوتا ہے تو ہمارے گاؤں کے مکانات چاہے وہ دن میں جس بھی نوع کے فنِ تعمیر کا مظاہرہ کرتے ہوں، رات سے اپنے مالکِ حقیقی کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔ تب گاؤں کا بانس راتنا ہی وحشت ناک دکھائی دینے لگتا ہے جتنا کہ کوئی جنگل! نئی اور پرانی اشیا آپس میں گڈمڈ سی ہو جاتی ہیں۔ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ آیا میں کسی دیوار کے کھنڈرات پر بیٹھا ہوا ہوں یا اس مسالہ پر جس سے ایک نئی چیز بنائی جائے گی۔ فطرت ایک تربیت یافتہ اور غیر جانب دار معلّم ہے جو نہ تو بھونڈے خیالات کو پھیلاتی ہے اور نہ کسی کی چاپلوسی ہی کرتی ہے۔ وہ نہ تو انتہا پسند ہے اور نہ ہی قدامت پسند۔ ایسی چاندنی کا تصور کیجئے جو کس قدر مہذب اور ساتھ ہی کس قدر وحشی ہے!

چاند کی روشنی دن کے مقابلے میں ہمارے علم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ وہ عام راتوں میں اس قدر دھندلی نہیں ہوتی جتنے کہ ہمارے اذہان عموماً گدلے ہوتے ہیں۔ یہ چاندنی تو اتنی ہی روشن ہوتی ہے جتنے کہ ہمارے جگمگ کرتے لمحات!

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

"ایسی ایک شب میں مجھے باہر ہی رہنے دو جب تک کہ سویرا
نہ ہو جائے اور سب کچھ از سر نو گڈ مڈ نہ ہو جائے۔"

دن کی روشنی کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی ہے اگر یہ اندر کی نمودِ سحر کا عکس نہیں ہے؟ ——— اگر صبح رُوح کے لئے کچھ آشکار نہیں کرتی تو رات کے پردے کو کس لئے اتار پھینکا جائے؟ ایسی صُورت میں تو یہ فقط ایک بھڑک دار، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چیز ہی رہ جائے گی۔

جب اوسین سورج سے خطاب کرتے ہوئے پکار اٹھتا ہے کہ ؎

"اندھیرے کا مسکن کہاں ہے؟
ستاروں کا گچھا دار گھر کہاں ہے؟
جب تم سبک روی سے ان کے قدموں کا پیچھا کرتے ہو،
ایک شکاری کی طرح آسمان پر ان کا تعاقب کر رہے ہوتے ہو،
جب تم بلند و بالا چوٹیوں پر چڑھ رہے ہوتے ہو،
تو وہ (ستارے) بنجر پہاڑیوں پر اتر رہے ہوتے ہیں"

ایسے میں کون ہے جو ستاروں کے ساتھ ان کے "گچھا والے گھروں" تک نہ جانا چاہے یا ان کی معیت میں "پہاڑوں پر اترنے" کا آرزو مند نہ ہو۔

تاہم اس کے باوجود رات کو بھی آسمان نیلا ہوتا ہے نہ کہ سیاہ، اس لئے کہ ہم زمین کے سایے کے اندر سے دُور دن کی فضا کو دیکھتے ہیں، جہاں سورج کی شعاعیں رنگ رلیاں منا رہی ہوتی ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

گھاس کا ایک پات

گھاس کا ایک پات لیجئے اور ایک منٹ کے لئے اس کی باریک تلوار ایسی بانسری نما سبز چھال کا بغور مشاہدہ کیجئے، اس میں آپ کو بظاہر کوئی اچھائی یا خوبصورتی نظر نہیں آئے گی۔ اس میں آپ کو نہایت معمولی استقامت اور نہایت ادنیٰ قدوقامت ملے گا اور چند نازک لمبی لکیریں ایک نقطے پر مرتکز ہوتی دکھائی دیں گی ——— یہ نقطہ ایک مکمل نقطہ نہیں ہوگا بلکہ کُند اور نامکمل نظر آئے گا جو فطرت کی صناعی کا کوئی قابلِ قدر یا بظاہر قابلِ توجہ نمونہ نہیں ہوگا۔ یوں لگے گا جیسے یہ اس غرض سے تخلیق کیا گیا ہے کہ اسے آج بھی قدموں تلے روندا جائے اور کل بھی اور پھر اسے تنور میں جھونک دیا جائے۔ یہ پات سرورنگ کا اندر سے کھوکھلا ڈنٹھل ہوتا ہے، کمزور اور چپٹا سا جو ریشہ دار ہلکے بھورے رنگ کی جڑوں تک اترا نظر آتا ہے اور اس کے اس کے بارے میں بغور سوچیں اور فیصلہ کریں کہ وہ تمام چمکدار پھول جو لرما کی فضا میں دمکتے ہیں اور وہ تمام تنومند اور خوش اندام شجر جو آنکھوں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کو طراوت بخشتے یا غذا مہیا کرتے ہیں۔ مثلاً سرو قد پام اور صنوبر، تنومند ایش اور شاہ بلوط، خوشبودار گلگل اور لدی پھندی انگور کی بیل ——— کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جس سے انسان نے اتنی محبت اور خدا نے جس کی اتنی قدر کی ہو جتنی کہ ایک ہلکے سبز رنگ کے اس مختصر سے نقطے کی (یعنی گھاس کے پات کی)۔ میرے نزدیک یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ہما! خداوند جب معجزہ دکھانے کو تھا تو یوں لگتا ہے جیسے لوگوں کے جم غفیر کے لئے اس کے پاس سب سے زیادہ متاثر کن "روٹیوں والا معجزہ" تھا۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ٹکڑیوں کی صورت میں "سبز گھاس کے اوپر" بیٹھ جائیں۔ وہ دراصل انھیں بحر و بر کی بنیادی غذا عطا کرنے والا تھا یعنی انسانی غذا کا سادہ ترین نمونہ! اس نے انھیں جڑی بوٹی کا بیج عطا کیا، انھیں اس جڑی بوٹی کے اوپر بیٹھنے کا حکم صادر فرمایا جو ان کی خوشی اور آرام کے لئے اپنی موزونیت کی بنا پر اتنا ہی بڑا انعام تھا جتنا کہ اس کا پھل ان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے تھا! چنانچہ یہ اکلوتا حکم اور عمل پوری طرح سمجھ میں آ گیا کہ کس طرح خداوند نے ہر کہہ دمہ کی آسودگی، تشفی اور غذا کے معاملے کو روئے زمین کی جملہ پتوں والی انواع میں سے اس سادہ ترین اور بظاہر سب سے حقیر شے کو مرحمت فرمایا تھا اور پھر اس نے اپنے مقصد کو بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا بھی تھا۔ اس پر غور کیجئے کہ ہم اس چراگاہ کے کس قدر دست نگر ہیں اور اس سیاہ زمین پر پھیلی ہوئی چمک دار تہ کے انگنت نازک اور امن پسند نیزوں یعنی گھاس کے بھی! "یہ کمیت!" لحظہ بھر کے لئے اس سب کچھ کا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

خیال کیجئے، جسے ہمیں ان دو لفظوں میں پہچان لینا چاہئے تھا۔ ساری کی ساری بہار اور گرمی ان میں موجود ہے ——— خاموش خوشبودار راستوں پر سیر۔ دوپہر کی تپش میں استراحت، گایوں، بھیڑوں کے ریوڑوں کو دیکھ کر خوشی۔ ——— چرواہوں کے اسلوبِ حیات کی قوت اور استغراق ——— اس دنیا پر اترنے والی زمردیں دھاریوں کے نیلے سایوں کی صورت میں خورشید کی ضو۔ (جس نے ہر کہیں سیاہ خاک یا جھلسانے والی گرد کو روک رکھا تھا) ——— رواں دواں سبک رفتار ندیوں کے ساتھ ساتھ چراگاہیں ——— کوتاہ قد پہاڑیاں اور نازک کنارے ——— نیچے کے ترچھے ڈھلانوں کے اوپر اٹھی ہوئی سمندر کی نیلی لکیر ——— تازہ سبزہ زار، صبح کی شبنم پاشی سے دھندلائے ہوئے، یا نیم گرم شام کو رکی ہوئی سورج کی روشنی میں نرم و گداز، مستی بھرے قدموں سے سلوٹ زدہ ——— جو محبت بھری آوازوں کو ملائم کر دیتے ہیں۔ ——— ان سب کا لبِ لباب ان دو سادہ الفاظ میں موجود ہے، اور یہی سبھی کچھ نہیں ہے، ہم اپنی ہی سرزمین پر بستے بستے ہوئے اس سادی انعام کی وقعت کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے۔ پھر بھی اگر ہم اس چراگاہ کی خوشبودار لامحدودیت پر ذرا سی دیر کے لئے غور کر لیں تو شیکسپیئر والا مخصوص حظ ہم پر زیادہ آشکار ہو جائے گا۔ ہر چند کہ قاشوں کی شکل میں ملے گا۔ بہار کے موسم میں ان چراگاہوں میں نکل جاؤ، جن کی ڈھلانیں ونٹر لینڈ ایسی جھیلوں کے کناروں سے لے کر پہاڑیوں کی زیریں چوٹیوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں دراز قد GENTIANS اور سفید رنگ نرگس

www.urduchannel.in

میں خلط ملط ہو کر گھاس زیادہ گھنی اور فراواں صورت میں اگتی ہے؟ اور جب تم بل کھاتی پہاڑی پگڈنڈیوں پر محراب دار شگوفوں سے لدی شاخوں کے نیچے سے گزرو ——— یعنی ان پگڈنڈیوں پر جو سدا سے سبز ساحلوں کے کناروں اور ٹیلوں پر سے اُبھرتی اور ڈوبتی ہوئی نشیب کی معطر لہریلی ڈھلانوں سے لے کر نیلے پانیوں تک پھیلی ہوتی ہیں اور جن پر یہاں وہاں تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں جو ساری فضا کو مسحور کن مٹھاس سے لبریز کر دیتے ہیں ——— تو تم بلند پہاڑیوں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا جہاں ہمہ وقت ہرے بھرے سبزے کی لہریں صنوبر کے سایوں کے درمیان اپنے طویل ناکوں سے گزرتی ہوئی خاموشی سے مجسوم رہی ہوتی ہیں۔ تب ہم شاید بالآخر انجیل کے ۱۴۷ نمبر کے گیت کے ان پُرسکون الفاظ کے مطلب کو جان لیں کہ اس نے گھاس کو تخلیق کیا کہ وہ پہاڑیوں کے اوپر اُگے۔

اس موضوع سے منسلک اور بھی متعدد سبق ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے مثلاً دیکھئے کہ گھاس کی نرالی خصوصیات جو اسے خدمتِ خلق کے لئے موزوں قرار دیتی ہیں۔ عجز اور زندہ دلی ہیں! اس کی عاجزی اس بات میں ہے کہ اسے حقیر ترین خدمات کی بجاآوری کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ یعنی پامال کئے جانے اور بطور چارہ استعمال کئے جانے کے لئے! گھاس کی زندہ دلی اس بات میں ہے کہ یہ ہر نوع کے تشدد اور اذیت کے دوران بھی خوش باش رہتی ہے۔ آپ اس پر بیلن پھیر دیں تو یہ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اگلے روز پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ آپ اسے کاٹ دیں تو یہ اپنی شاخوں کو فزوں تر کر لیتی ہے جیسے گویا آپ کی احسان مند ہو۔ آپ اسے پاؤں تلے روندیں تو یہ تیز تر مہک دیتی ہے۔ موسمِ بہار کی آمد پر یہ ساری دھرتی کے ساتھ مل کر جشن مناتی ہے ـــــ پھولوں کے بوقلموں شعلوں کے ساتھ تمتماتے ہوئے اور اپنی ثمر دار قوت کی نرم گہرائی میں لہراتے ہوئے۔ جب موسمِ سرما آتا ہے تو بھی یہ بدستور اگتی رہتی ہے مگر یہ اپنی روئیدگی سے اپنے ساتھی پودوں کا مذاق نہیں اڑاتی۔ یہ ان کی طرح سوکھ کر بے رنگ یا بے پات بھی نہیں ہوتی، بلکہ سدا ہری بھری رہتی ہے اور سفید بالوں والے کہرے کو خوش آمدید کہنے کے لئے مزید تاباں اور شاداں ہستی بن جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

MUSKRAHAT HI MUSKRAHAT
www.urduchannel.in

مُسکراہٹ ہی مُسکراہٹ

Inder Jit Lall

Rs. 40

اندرجیت لال ـــــ آفسٹ چھپائی ـــ قیمت مجلد ۴۰ روپے

زندگی کی تلخیوں اور اداسیوں سے مدافعت کا ایک ہی حربہ ہے کہ حسِ مزاح کی لطافت سے کام لیا جائے۔ خوش قسمتی سے اردو کے نثری ادب میں بڑے بڑے فنکاروں نے مزاح سے بھرپور شاہکار پیدا کئے ہیں۔ جو ہمارے لئے فرصت کے لمحات میں کچھ مسکرانے کا جواز پیدا کر دیتے ہیں۔ مسکراہٹ یوں بھی زندگی میں بہت ضروری ہے تاکہ یہ زندگی میں آئے دن کے دکھوں، دشواریوں اور آلام سے بوجھل ہی نہ بن جائے۔ خوش قسمتی سے مزاحیہ تحریریں ہیں شگفتگی اور تازگی بخشتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں پطرس، یوسفی، کپور، کرشن چندر، شوکت تھانوی، ابن انشا، احمد جمال پاشا، رشید احمد صدیقی، فرقت کاکوروی، وجاہت علی سندیلوی، شفیق الرحمان، فکر تونسوی، یوسف ناظم، حضرت آوارہ، اندرجیت لال وغیرہ کے ۲۳ شاہکار جمع کر دیئے گئے ہیں۔ خصوصاً ابتدائیہ "مسکراہٹ" آپ کو سارے مزاحیے پڑھنے پر راغب کرے گا۔

* "یہ شاہ پاروں کا انتخاب کر کے مؤلف نے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے"
— (وجاہت علی سندیلوی)

* مؤلف کی شمولہ تخلیقات اجنبی نہیں لگتیں، بلکہ پیاری لگتی ہیں جس سے اندرجیت لال کے ذوقِ نظر کی تائید کرنی پڑتی ہے۔
— (فکر تونسوی)

* شعری مزاح کے کئی انتخاب منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ لیکن اردو نثر کے مزاح کا یہ پہلا اور واحد انتخاب ہے جس کی اشد ضرورت تھی اُسے اب مؤلف نے پورا کر دیا ہے" (یوسف ناظم)

* یہ مجموعہ قاری کو منہ کا گول گپا بنانے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے (ڈاکٹر بدیع الزماں خاور)

Inder Jit Lall has done a signal service collecting the selected writings ... Times of I

The compilation has fulfilled a long felt need in Urdu's prose humour. Pat

These writings have no time value and can be read and enjoyed at any t... Indian Expr
and in any part of the country.

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ghrib Ke Inshaiye eboc | Sea

aghrib Ke Insha..

JANWAR SE INSAAN TAK AWARD WINNER
(Essays)

Inder Jit Lall Rs. 40

جانور سے انسان تک

انعام یافتہ

(انشائیے خاکے اور وکالیے)

قیمت: بہ روپے ★

اندر جیت لال

مصنف معلماتی سائنس۔ ادب۔ فنون لطیفہ۔ شخصیات اور بچوں کے ادب پر بیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ان کی ادبی زندگی خود نوشت کے انداز میں میرا قلم اور میرا ادبی سفر ابواب میں پیش کرتی ہے۔

چند آدبی خاکے (پیچوشا پوتا بادشاہ) چند انشائیے (مسکراہٹ۔ جانور سے انسان تک۔ ضمیر کی آواز۔ غصہ من نہ ہنڈائے) چند مزاحیے و طنزیے (ایرا غیرا بھول۔ گھر جوائی۔ ناشر بنام شاعر۔ میں نے کہا جی۔ واہ رے گدھے) شامل ہیں۔ جو ہر فرد بشر کو شادابی و شگفتگی عطا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

"اندر جیت لال خود طبعاً بڑے ہنس مکھ ہیں۔ اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں شگفتگی کا احساس رہتا ہے" ——— یوسف ناظم

"اُن میں حسنِ مزاح کی خوبی وافر مقدار میں پائی جاتی ہے" ——— فکر تونسوی

اُن کے ذوقِ نظر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ——— وجاہت علی سندیلوی۔

کیا کمال ہے کہ ہلکے پھلکے مضامین بھی مصنف بڑی خوبی سے لکھ سکتے ہیں (جوگندر پال)

These studies quite new to Urdu readers deal with diverse topics in an inimi style.

Written on diverse themes these essays are informative, artistic and educa

In racy prose which has verve and precision, Inder Jit Lall has taken ca nuances of the vast repertory of Urdu vocabulary with the felicity of a true

Pa

Evening News (Hindustan Ti

Times of

Scanned by CamScanner